الرسالہ

Al-Risala

February 1995 • Issue 219 • Rs. 7

جو لوگ نتیجہ کو آج پانا چاہیں
وہ ہمیشہ ناکام رہیں گے
کیوں کہ اس دنیا میں نتیجہ ہمیشہ کل حاصل ہوتا ہے۔



The Great Mosque, Damascus

WOMAN BETWEEN ISLAM AND WESTERN SOCIETY

By Maulana Wahiduddin Khan

The status of woman in Islam is the same as that of man. Injunctions about honour and respect enjoined for one sex are enjoined equally for the other sex. So far as rights in this world and rewards in the Hereafter are concerned, there is no difference between the sexes. In the organization of daily living, both are equal participants and partners. Yet Islam sees man as man and woman as woman and, considering the natural differences, it advocates the principle of the division of labour between the two sexes rather than the equality of labour.

Price Rs. 85
ISBN 81-85063-75-3

AL-RISALA BOOKS
The Islamic Centre
(Publications Division)
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013
Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4697333

Distributed by
UBS Publishers' Distributors Ltd.
5 Ansari Road, New Delhi 110 002
Bombay Bangalore Madras Calcutta Patna Kanpur London



الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

فروری ۱۹۹۵، شمارہ ۲۱۹

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4697333
Single copy Rs. 7 ☐ Annual Subscrption Rs. 70/$ 20 (Air mail)
Printed and published by Dr Saniyasnain Khan at Nice Printing Press, Delhi

روزہ : اخلاقی ڈسپلن

روزہ ایک عبادت ہے۔ اسی کے ساتھ وہ اخلاقی ڈسپلن کی تربیت ہے۔ روزہ آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اعلیٰ اخلاقی اصولوں کے ساتھ لوگوں کے درمیان زندگی گزارے۔ لوگوں کے ساتھ اس کا سلوک ذمہ دارانہ سلوک ہو نہ کہ بے قید سلوک۔ روزہ بتاتا ہے کہ تم اپنی آزادی کو محدود طور پر استعمال کرو نہ کہ لامحدود طور پر۔ روزہ خود عائد کردہ پابندی (self-restraint) کا سبق ہے۔ یہ خود عائد کردہ پابند زندگی ہی تمام اصلاحات کی جان ہے۔

ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ روزہ ڈھال ہے۔ پس جب تم میں سے کسی کے روزہ کا دن ہو تو وہ نہ فحش گوئی کرے اور نہ شور کرے۔ اور اگر کوئی شخص اس کو گالی دے یا اس سے لڑائی کرے تو وہ کہہ دے کہ میں تو روزہ دار ہوں :

والصیامُ جُنّۃ - فإذا کان یومُ صومِ احدِکم فلا یرفُث ولا یَصْخَب - فإن سابّہ احدٌ او قاتلَہ فلیقُل إنّی صائمٌ (متفق علیہ)

روزہ بظاہر کھانا اور پانی چھوڑنے کا نام ہے۔ مگر اسی کے ساتھ اس کا تعلق پوری زندگی سے ہے۔ روزہ جس طرح آدمی سے یہ کہتا ہے کہ تم کھانا اور پینا چھوڑ دو، اسی طرح روزہ اس سے یہ بھی کہتا ہے کہ اگر تم سچے روزہ دار ہو تو تم کو چاہیے کہ تم گندی بات منہ سے نہ نکالو۔ تم شور وغل نہ کرو۔ حتی کہ اگر کوئی شخص تم کو گالی دینے لگے تب بھی تم اس کے جواب میں گالی نہ دو بلکہ یک طرفہ طور پر اس کو نظر انداز کر دو۔

یہ حدیث روزہ کی اسپرٹ کو بتاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رمضان میں کھانے پینے کا ترک ایک علامتی ترک ہے۔ کھانے کا وقتی روزہ ایک اور مستقل روزہ کی تربیت ہے۔ یہ جزئی روزہ داری کے ذریعہ ایک وسیع تر روزہ داری کے لیے آدمی کو تیار کرنا ہے۔

اسلامی زندگی حقیقۃً ایک روزہ دارانہ زندگی ہے۔ اسلام کا مطلب یہ ہے کہ آدمی دنیا میں بے قید بن کر نہ رہے۔ بلکہ وہ حرام وحلال میں فرق کرے۔ وہ میٹھا بول بولے اور کڑوا بول نہ بولے۔ وہ لوگوں کے ساتھ انصاف کا سلوک کرے اور بے انصافی والے سلوک سے اپنے آپ کو بچائے۔ وہ لوگوں کے حقوق ادا کرے اور حق تلفی سے اپنے آپ کو دور رکھے۔ روزہ گویا ایک سالانہ کورس

ہے جس کے ذریعہ آدمی کو اس قابل بنایا جاتا ہے کہ وہ سماج میں دوسروں کے ساتھ اخلاقی ڈسپلن کے ساتھ رہ سکے۔

اخلاقی ڈسپلن کی زندگی یک طرفہ برداشت کا تقاضا کرتی ہے۔ وہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ آپ دوسروں کی طرف سے ناخوش گوار تجربہ پیش آنے کے باوجود مشتعل نہ ہوں۔ دوسروں کی زیادتی کو بھلا کر آپ ان سے معتدل انداز میں معاملہ کر سکیں۔ یہ ایک کڑی آزمائش ہے اس لیے آدمی کو رمضان میں کھانے پینے جیسی ناگزیر ضرورت کے معاملہ میں برداشت کی روش پر چلایا جاتا ہے۔ کیوں کہ جو شخص زیادہ بڑی چیز کو برداشت کرلے اس کے لیے چھوٹی چیز کو برداشت کرنا آسان ہو جائے گا۔

حدیث میں ہے کہ مومن کی مثال اور ایمان کی مثال ایسی ہے جیسے کھونٹے کے ساتھ رسّی میں بندھا ہوا گھوڑا۔ وہ گھومتا ہے پھر وہ کھونٹے کی طرف واپس آجاتا ہے۔ روزہ بھی گویا اسی قسم کا ایک روک ہے۔ آپ روزہ رکھے ہوئے ہیں۔ ایسی حالت میں ایک شخص آپ کو کوئی بری بات کہہ دیتا ہے، آپ کو غصہ آجاتا ہے۔ مگر فوراً ہی پیاس کی وجہ سے سوکھا ہوا حلق آپ کو یاد دلاتا ہے کہ آپ روزہ سے ہیں۔ آپ اپنے غصہ کو ضبط کر لیتے ہیں۔ اور کڑوا بول بولنے والے کو نرم انداز سے جواب دے کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

ایک شخص آپ کو جسمانی تکلیف پہنچاتا ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ اس کو تکلیف پہنچا کر اس سے انتقام لیں۔ عین اسی وقت بھوک کی وجہ سے نڈھال جسم آپ کو یاد دلاتا ہے کہ آپ نے خدا کے لیے روزہ رکھا ہے۔ اس کے بعد آپ کے ہاتھ اور پاؤں رک جاتے ہیں۔ جس آدمی سے آپ انتقام لینا چاہتے تھے اس کے لیے دعا کر کے بات کو وہیں ختم کر دیتے ہیں۔

شیطان مختلف مواقع پر آپ کو بہکانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس وقت روزہ آپ کا مددگار بن جاتا ہے۔ روزہ کی تربیت اور روزہ کی عبادت سے آپ کے دل میں جو نرمی اور روح میں جو صفائی پیدا ہوتی ہے وہ آپ کے لیے شیطان کے حملوں کے مقابلہ میں ڈھال کا کام کرتی ہے۔ اور آپ کو شیطان کے فتنہ کا شکار ہونے سے بچا لیتی ہے۔

نوٹ : یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی (نیشنل چینل) سے ۴ مارچ ۱۹۹۴ کو نشر کی گئی۔

رمضان کا روزہ

دہلی کے ایک مسلمان تاجر جناب محمد عثمان صاحب سے ۲۹ نومبر ۱۹۹۳ کو ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ روزہ ہر قسم کی ایمرجنسی کا سامنا کرنے کی تربیت ہے۔ روزہ کی اس تشریح کی تصدیق ایک حدیث سے ہوتی ہے جس میں روزہ کو صبر کا مہینہ (شہر الصبر) کہا گیا ہے۔ صبر کے اصل معنی ہیں رک جانا۔ صبر کا لفظ جزع کا نقیض ہے۔ الجوہری نے کہا کہ صبر کا مطلب ہے جزع کے وقت اپنے آپ کو تھامنا (الصبر حبس النفس عند الجزع)

زندگی میں ہمیشہ خلافِ مزاج باتیں پیش آتی ہیں۔ زندگی نام ہے ناموافق باتوں کا سامنا کرتے ہوئے سفر حیات طے کرنے کا۔ جو آدمی جتنا زیادہ بامقصد اور جتنا زیادہ بااصول ہو اتنا ہی زیادہ اس کو اپنی پسند کے خلاف چیزوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اس صفت کی ضرورت دنیوی معاملات میں بھی پیش آتی ہے اور دینی معاملات میں بھی۔ روزہ اسی قسم کی صابرانہ زندگی کی تربیت ہے۔ روزہ میں آدمی کے معمولات ٹوٹتے ہیں۔ وقت پر کھانا اور وقت پر سونا اس کو میسر نہیں آتا۔ مسلسل ایک مہینہ تک اس کو بھوک، پیاس، بے خوابی جیسے تجربات سے سابقہ پیش آتا ہے۔ طبیعت کے خلاف عمل کرنے کی وجہ سے اس کے اندر جھنجلاہٹ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، مگر اس پر بھی اس کو صبر کرلینا پڑتا ہے۔

برداشت کی اس زندگی کو خود اپنے ارادہ سے اختیار کرنے کا نام روزہ ہے۔ لوگ مجبورانہ صبر کرتے ہیں، روزہ دار اختیارانہ صبر کرتا ہے۔ جن چیزوں کو لوگ دباؤ کے تحت چھوڑتے ہیں، روزہ دار ان چیزوں کو اصول کی خاطر چھوڑ دیتا ہے۔ جس صابرانہ روش کو لوگ ذاتی مفاد کے لیے اختیار کرتے ہیں، اس صابرانہ روش کو روزہ دار خدا کی مرضی کے لیے اختیار کرتا ہے۔ دوسروں کا صبر اگر اپنی ذات کے لیے ہے تو مومن کا صبر خداوند ذوالجلال کے لیے۔ روزہ ایک بے روح رسم نہیں، وہ ایک زندہ تربیت ہے جس کا تعلق پوری انسانی زندگی سے جڑا ہوا ہے۔

رمضان کے مہینہ میں جو آدمی اس کورس کو صحیح طور پر مکمل کرلے وہ اس کے بعد پورے سال کے لیے ایک ایسا انسان بن جائے گا جو ہنگامی حالات میں بھی معتدل زندگی گزارے، جو بے صبری کے مواقع پر بھی صابر انسان بنا رہے۔

یہ انسان

آدمی پر جب آخری وقت آتا ہے اور جب اس کی جان حلق تک پہونچ جاتی ہے تو اس پر عالم غیب کی حقیقتیں کھل جاتی ہیں۔ یہی بات قرآن میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے کہ ہم تم سے زیادہ اس شخص کے قریب ہوتے ہیں مگر تم نہیں دیکھتے (الواقعہ ۸۵)

اس وقت اگرچہ آدمی کی آنکھیں بند ہوتی ہیں۔ مگر اگلی دنیا کو وہ پوری طرح دیکھ رہا ہوتا ہے۔ اس وقت وہ دار الامتحان سے نکل کر دار الجزار کے دروازہ پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس سے پہلے وہ جس بات کو بتانے کے بعد بھی نہیں جانتا تھا، اس کو وہ بتائے بغیر جان لیتا ہے۔

یہ لمحہ بھی کیسا عجیب ہے جو ہر انسان پر لازمی طور پر آنے والا ہے۔ آج آدمی کا یہ حال ہے کہ وہ کھلی آنکھ سے بھی نہیں دیکھتا۔ وہ وقت آنے والا ہے جب کہ وہ بند آنکھ سے دیکھے گا۔ آج آدمی دلائل کو سننے کے بعد بھی ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ کل کا دن وہ دن ہوگا جب کہ وہ دلیل کے بغیر ہر چیز کو مان لے گا۔ آج وہ زبانی اقرار کی سطح پر حقیقت کو ماننے کے لیے آمادہ نہیں، کل وہ سرافگندگی کی سطح پر حقیقت کے آگے جھک جائے گا، اگرچہ اس وقت کا جھکنا اس کے کچھ کام نہیں آئے گا۔

آدمی کا سب سے بڑا امتحان یہ ہے کہ وہ حقیقت کا اس وقت اعتراف کرے جب کہ حقیقت ابھی غیب کے پردہ میں چھپی ہوئی ہے۔ وہ دیکھے بغیر مانے اور بھگتے بغیر احساس کرے۔ یہی آدمی کا اصل امتحان ہے۔ جو شخص اس امتحان میں پورا اترے وہ کامیاب ہے اور جو شخص اس امتحان میں پورا نہ اترے وہ ناکام۔

نادان آدمی ظاہری عظمتوں کی سطح پر اسلامی اخلاق کا ثبوت دے رہا ہے، حالاں کہ اس کو مخفی عظمتوں کی سطح پر اسلامی اخلاق کا ثبوت دینا ہے۔ آدمی ان امور میں اسلامی قیادت کے فرائض انجام دے رہا ہے جو اخباروں میں نمایاں کی جاتی ہیں، حالاں کہ اس کو ان امور میں اسلامی قیادت کی ذمہ داریاں ادا کرنا ہے جو اخباروں کے صفحہ میں جگہ نہیں پاتیں۔ آدمی ان میدانوں میں سرگرمی دکھا رہا ہے جن کا چرچا انسانوں کی محفل میں ہوتا ہے، حالاں کہ اس کو ان میدانوں میں سرگرمیاں دکھانا ہے جن کا چرچا فرشتوں کے درمیان کیا جاتا ہے۔ لوگ آیات الٰہی کے بدلے دنیا خرید رہے ہیں، حالاں کہ انھیں آیاتِ الٰہی کے ذریعہ آخرت کا سودا کرنا چاہیے۔

فسادفی الارض

فلولا کان من القرون من قبلکم اولوا بقیة ینهون عن الفساد فی الارض إلّا قلیلا ممّن انجینا منهم و اتبع الذین ظلموا ما اُترفوا فیه وکانوا مجرمین وما کان ربك لیهلك القریٰ بظلم و اهلها مصلحون (ہود ۱۱۷-۱۱۶)

پس کیوں نہ ایسا ہوا کہ تم سے پہلے کی قوموں میں ایسے اہل بقیہ ہوتے جو لوگوں کو زمین میں فساد کرنے سے روکتے۔ ایسے تھوڑے ہی لوگ نکلے جن کو ہم نے ان میں سے بچالیا۔ اور ظالم لوگ تو اسی آسودگی میں پڑے رہے جو انھیں ملا تھا اور وہ مجرم تھے۔ اور تیرا رب ایسا نہیں کہ وہ بستیوں کو ناحق تباہ کر دے حالاں کہ اس کے باشندے مصلح ہوں۔

یہاں پچھلی قوموں سے مراد پچھلی مسلم امتیں ہیں۔ پچھلی مسلم امتوں کا حال بتاکر موجودہ مسلم امت کو متنبہ کیا گیا کہ تم کو ان کی جیسی غلط روش سے بچنا ہے۔ ورنہ تمہارا بھی وہی انجام ہوگا جو ان کا انجام ہوا۔ خدا کی دنیا میں سب کے لئے ایک ہی قانون ہے، یہاں ایک کو دوسرے پر کوئی امتیازی خصوصیت حاصل نہیں۔

بقیہ کا لفظ عربی زبان میں بہتر بقیہ کے لئے آتا ہے۔ فلان ذو بقیة یا فلان بقیة قومه کا مطلب ہے، وہ اپنی قوم کے اخیار میں سے ہے۔ لسان العرب کے مطابق، اولوا البقیہ کے معنی ہیں، اصحاب تمیز یا اصحاب فہم (جلد ۱۴، صفحہ ۸۱) ابن جریر الطبری اپنی تفسیر میں اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(اولوا بقیة) یقول: ذو وبقیة من الفهم والعقل یعتبرون مواعظ الله ویتدبرون حججه فیعرفون مالهم فی الایمان بالله وعلیهم فی الکفر به (۱۲/۱۳۸)

اولو بقیہ یعنی فہم اور عقل رکھنے والے جو اللہ کے مواعظ سے نصیحت لیں اور اس کے دلائل پر غور کریں۔ تاکہ وہ جانیں کہ ایمان باللہ کی انھیں کیا جزا ملے گی اور اللہ کے انکار پر ان کا انجام کیا ہونے والا ہے۔

قرآن کے مترجمین نے اولو بقیہ کا جو ترجمہ کیا ہے، اس میں سے چند یہ ہے ــــ شاہ ولی اللہ دہلوی: اہل خرد۔ شاہ عبد القادر دہلوی: صاحب شعور۔ مولانا اشرف علی تھانوی: سمجھدار۔ اس آیت میں اولو بقیہ کا صحیح ترجمہ یہی ہے۔

فساد فی الارض سے روکنا اور انسانی معاشرہ میں اصلاح کا ماحول پیدا کرنا انتہائی اہم ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت زیادہ مطلوب کام ہے۔ مگر یہ کوئی سادہ کام نہیں۔ یہ نہایت دانشمندی کا کام ہے۔ اس کو صرف وہی لوگ انجام دے سکتے ہیں جو فہم وبصیرت کے مالک ہوں۔ جن کی نظر صرف ظاہری حالات پر نہ ہو بلکہ چھپی ہوئی حقیقتوں تک کا وہ ادراک کرلیں۔ جو صرف حال کو جاننے والے نہ ہوں بلکہ اپنی فراست سے مستقبل تک کا اندازہ کرسکتے ہوں۔

زندگی ایک نہایت پیچیدہ نظام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو امتحان کی بنا پر آزادی عطا کی ہے۔ اس لئے زندگی میں اصلاح کا معاملہ بہت زیادہ نازک کام بن جاتا ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ برائی کو آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود اس سے براہ راست تعرض نہیں کیا جاتا۔ بلکہ بالواسطہ انداز میں اس کو سدھارنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کبھی خارجی برائی کو دور کرنے کا آغاز نفسیات کی اصلاح سے کرنا پڑتا ہے۔ کبھی برائی کرنے والوں سے ٹکراؤ کرنے کے بجائے مصلح خود اپنے آپ کو پیچھے ہٹا لیتا ہے۔ کبھی ایک کھلی ہوئی برائی کو برداشت کرنا پڑتا ہے کیونکہ اس سے الجھنے میں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ شدید تر برائی پیدا ہو جائے گی۔ کبھی ایک فساد کو ختم کرنے کے لئے خاموش تدبیر کرنی پڑتی ہے کیوں کہ حالات کا تجزیہ بتاتا ہے کہ اگر احتجاج اور مظاہرہ کا انداز اختیار کیا گیا تو ایک مقامی برائی عمومی برائی بن کر سارے معاشرہ کو تباہ کر دے گی۔ کبھی ایک ناقابل برداشت صورت حال کو برداشت کرنا پڑتا ہے، کیوں کہ اس کے بغیر دور رس منصوبہ بندی ممکن نہیں ہوتی۔

زندگی اھون البلیتین اور اخف الضررین میں انتخاب کا نام ہے۔ نادان آدمی اکثر مفروضہ معیار کے پیچھے دوڑتا ہے جب کہ امکانات کا تقاضا ہوتا ہے کہ وہ معیار سے کم پر راضی ہو جائے۔ نادان آدمی ایک چھلانگ لگا کر تمام روایات کو توڑ ڈالتا ہے جب کہ اندیشہ ہوتا ہے کہ روایات کو توڑنے کے بعد اصلاح کا امکان ہی ختم ہو جائے۔ اس طرح کی سیکڑوں باتیں ہیں جن کو جاننا اور اپنی اصلاحی اسکیم میں ان کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔ صرف دانش مند آدمی ہی ان کو جانتا ہے، اس لئے دانش مند آدمی ہی فساد کا خاتمہ کرکے اصلاح کا دور لا سکتا ہے۔

موت کا مسئلہ

۱۹ نومبر ۱۹۹۴ کو دہلی کے تمام اخباروں کے صفحہ اول کی نمایاں خبر یہ تھی کہ جنرل بپن چندرا جوشی کا دہلی میں حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر ابھی صرف ۵۹ سال تھی۔ بوقت وفات وہ آرمی چیف کے عہدہ پر تھے۔

لمبی سروس کے بعد اب وہ اپنی آخری ترقی کے دور میں پہنچے تھے اور اس وقت سینئر موسٹ سروس چیف کی حیثیت رکھتے تھے۔ ۱۸ نومبر کو گولف کھیلنے کے بعد انھوں نے سینہ میں درد بتایا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بے ہوش ہوگئے۔ فوری طور پر بہترین میڈیکل امداد بہم پہنچائی گئی۔ مگر وہ دوبارہ ہوش میں نہ آسکے۔ بے ہوشی کی حالت ہی میں ان کا خاتمہ ہوگیا۔

جنرل جوشی کے حالات کے ذیل میں بتایا گیا ہے کہ انھیں ایکس سروس مین کا بہت خیال رہتا تھا۔ ہندستان میں ایک سولجر ۳۵ سال کی عمر میں ریٹائر ہوتا ہے اور افسر ۴۸ سال کی عمر میں۔ اس طرح ہر سال فوج سے ستر ہزار آدمی ریٹائر ہوتے ہیں۔ ان کو ان ریٹائر ہونے والوں کی بہبود کی بہت فکر رہتی تھی۔ ان کا قول تھا کہ آج کا سپاہی کل کا ایکس سروس مین ہے:

Today's soldier is tomorrow's ex-serviceman.

جنرل جوشی اگر اور دور تک دیکھ سکتے تو کہتے کہ آج کا سولجر اور ایکس سروس مین دونوں ہی کل کے اعتبار سے آخرت کے باسی ہیں۔ دونوں ہی کو موت کے بعد آخرت کے ٹسٹ پر پورا اترنا ہے۔ اس کے بعد ہی یہ فیصلہ ہوگا کہ کون کیسا تھا۔ اور کون کیسا۔ کون خوش بخت تھا اور کون بدبخت۔ کون کامیاب تھا اور کون ناکام۔

لوگ موت سے پہلے کی زندگی میں الجھے رہتے ہیں، حالاں کہ دانش مندی یہ ہے کہ آدمی موت کے بعد کی زندگی کے مسائل کی سب سے زیادہ فکر کرے۔ لوگ انسانوں کی طرف سے پیش آنے والی باتوں کو اہمیت دیتے ہیں، حالاں کہ حقیقت کا تقاضا ہے کہ خدا کی باتوں کو سب سے زیادہ اہمیت دی جائے۔ لوگ دنیا کے قانون کی پکڑ سے بچنے کی تدبیریں کرتے ہیں حالاں کہ اس سے زیادہ انھیں اس بات کی تدبیر کرنی چاہئے کہ کہیں وہ خدا کی پکڑ میں نہ آجائیں۔

صحیح ردعمل

۲۰ نومبر ۱۹۹۴ کو منسٹری آف ایجوکیشن کی طرف سے نئی دہلی میں ایک آل انڈیا سیمنار ہوا۔ اس کا موضوع تھا اقدار پر مبنی تعلیم (value-based education) اس کی کارروائیاں نہرو میوزیم کے ہال میں انجام پائیں۔

اس کے شرکاء میں سے ایک پروفیسر آر سندر راجن تھے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ آزادی کے بعد مختلف محاذ پر ہماری ناکامیوں کا راز صرف ایک ہے، اور وہ ہے صحیح ردعمل کا فن (art of right response) نہ جاننا۔ یہ بلاشبہ زندگی کا ایک اہم ترین اصول ہے، اور اس کا تعلق ہر شخص اور ہر گروہ سے ہے۔

خواہ فرد کا معاملہ ہو یا قوم کا معاملہ۔ ہمیشہ ہر ایک کو مختلف قسم کے حالات سے سابقہ پیش آتا ہے۔ ان حالات میں کامیابی یا ناکامی کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ آپ نے صورت حال کا کیسا جواب (response) دیا۔ صحیح جواب کا نتیجہ کامیابی کی صورت میں نکلتا ہے اور غلط جواب کا نتیجہ ناکامی کی صورت میں۔

مثلاً کسی فرد یا گروہ نے ایسا واقعہ کیا جو آپ کو پسند نہ تھا۔ اب اس کے جواب کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آپ فوراً بھڑک اٹھیں اور جذباتی تاثر کے تحت جو آپ کے خیال میں آئے وہ کارروائی آپ کر گزریں، ایسے جواب کا یقینی نتیجہ ناکامی ہے اور اسی کے ساتھ نقصان میں مزید اضافہ۔

دوسری صورت یہ ہے کہ جب ناپسندیدہ واقعہ پیش آیا تو آپ نے غصہ ہونے کے بجائے ٹھنڈے دماغ سے سوچنا شروع کیا۔ آپ نے آس پاس کے لوگوں سے مشورہ کیا۔ معاملہ کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد آپ نے خالص عقلی سطح پر ایک فیصلہ کیا۔ یہ صورتحال کا صحیح جواب ہے، اور ایسے جواب کا یقینی نتیجہ کامیابی ہے۔

صحیح ردعمل کا فن سیکھئے، اور آپ ہمیشہ کامیاب رہیں گے۔ یہ اصول فرد کے لئے بھی ہے اور وسیع تر معنوں میں قومی زندگی کے لئے بھی۔

یکساں احترام

مرکزی حکومت ہند کی منسٹری آف ہیومن رسورس ڈولپ منٹ کے زیر اہتمام ۱۹-۲۰ نومبر ۱۹۹۴ کو سرو دھرم سماگم ہوا۔ اس کے اجلاس تین مورتی ہاؤس (نئی دہلی) میں منعقد ہوئے۔ اسی کے تحت ۲۰ نومبر کو ایک سمینار ہوا جس کا موضوع بحث اقدار پر مبنی تعلیم (value-based education) اس اجلاس کے چیر پرسن پروفیسر آر سندر راجن تھے۔

اس سمینار کے ایک مقرر مسٹر ایچ وائی شاردا پرساد تھے۔ وہ سابق وزیر اعظم ہند مسز اندرا گاندھی کے پرسنل ایڈوائزر رہ چکے ہیں۔ انھوں نے اپنی تقریر میں سرو دھرم سمبھاو کی تشریح کی۔ انھوں نے کہا کہ سرو دھرم سمبھاو کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ آدمی ہر مذہب کے لئے یکساں جذبہ رکھے۔ یہ اصول اسٹیٹ کے معاملہ میں درست ہے جس کو ہر مذہب کے ماننے والوں کے لئے یکساں تحفظ دینا چاہئے۔ مگر نفسیاتی اعتبار سے یہ ایک غیر حقیقت پسندانہ بات ہوگی کہ ایک شخص ہر مذہب کے لئے یکساں رغبت رکھے۔ ایک آدمی ہر بھائی کا یکساں احترام کر سکتا ہے۔ مگر وہ ان کے ساتھ ویسی محبت نہیں کر سکتا جیسی محبت اس کے اندر اپنی ماں کے لئے ہوتی ہے۔ اس لئے ہمیں (سرو دھرم سمبھاو کے بجائے) سرو دھرم سمان کہنا چاہئے۔ (مسٹر شاردا پرشاد کے اصل الفاظ صفحہ کے نیچے درج ہیں)

مسٹر شاردا پرساد نے جو بات کہی وہ نہایت درست اور مبنی برحقیقت ہے۔ ہر مذہب کو یکساں سچائی ماننا اور ہر ایک سے یکساں محبت رکھنا یقینی طور پر غیر فطری ہے۔ اس لئے ایک شخص لکھنے اور بولنے کی سطح پر تو ایسا نظریہ بیان کر سکتا ہے۔ مگر قلبی سطح پر یہ ممکن نہیں کہ آدمی متعدد صداقت کو یکساں طور پر مانے اور ہر ایک سے یکساں محبت کرے۔

Sarva Dharma Samabhava would mean equal feeling towards all religions. This would be right in regard to the State — which must provide equal protection towards the practitioners of all religions. But it would be psychologically unrealistic for an individual to practise equal affection for all religions. A person might respect all brothers but would not love them with the same love that he has for the mother. Therefore we should speak of Sarva Dharma Sammaan (respect for all religions).

H.Y. Sharada Prasad, New Delhi (Tel. 5585439)

مہاتما گاندھی اس نقطۂ نظر کے سب سے بڑے علم بردار تھے۔ وہ ہمیشہ "رام رحیم ایک ہے" کی بات کیا کرتے تھے۔ مگر وہ بھی ایک حد تک ہی اس پر قائم رہ سکے۔ ۲۵ جنوری ۱۹۴۸ کو جب گاڈسے نے انھیں گولی ماری اور وہ خون میں لت پت ہو کر گر پڑے تو موت سے پہلے آخری لفظ جو ان کی زبان سے نکلا، وہ "ہے رام" تھا نہ کہ "ہے رام، ہے رحیم"۔

مسٹر شاردا پرساد نے اس معاملہ میں جو تقسیم کی ہے وہی صحیح ترین تقسیم ہے۔ یعنی حکومتی پالیسی میں تو یہی ہونا چاہئے کہ ہر مذہب کے ماننے والوں کو یکساں مراعات اور یکساں تحفظ دیا جائے۔ کیوں کہ حکومت پورے ملک کی نمائندہ ہوتی ہے۔ مگر جہاں تک افراد کا تعلق ہے، ہر فرد کا یہ حق تسلیم کرنا چاہئے کہ وہ جس مذہب کو چاہے مانے اور جس مذہب پر چاہے قلبی اعتقاد رکھے۔

سماج میں امن اور بھائی چارہ قائم کرنے کی تدبیر یہ ہے کہ لوگوں کو یہ تلقین کیا جائے کہ وہ ہر ایک کا یکساں احترام کریں۔ قلبی اعتبار سے اپنے مذہب پر عقیدہ رکھتے ہوئے خارجی سلوک میں ہر ایک دوسرے کا پورا احترام کرے۔ ہر ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے۔

سچائی جوتے کپڑے جیسی چیز نہیں ہے کہ خواہ اس کپڑے کو پہنا جائے یا اس کپڑے کو۔ سچائی عین اپنی فطرت کے اعتبار سے یکسوئی چاہتی ہے۔ ٹروتھ وہی ہے جو دی ٹروتھ ہو۔ جو ٹروتھ دی ٹروتھ نہ ہو وہ یقینی طور پر ٹروتھ بھی نہیں۔

اسپین کا سفرنامہ

اسپین کا سفرنامہ زیر تیاری ہے۔ اس کی خصوصی اہمیت کی بنا پر اس کو ایک ہی شمارہ میں بطور نمبر شائع کیا جائے گا۔ اس کی ضخامت موجودہ الرسالہ سے زیادہ ہوگی اس لیے اس کی قیمت بھی کچھ زیادہ ہوگی۔ تفصیلی اعلان ان شاء اللہ آیندہ شائع کیا جائے گا۔

منیجر الرسالہ

قرآن کہاں سے آگیا

اترپردیش کے ایک گاؤں کا واقعہ ہے۔ دو مسلمان میں ایک جائداد کا جھگڑا تھا۔ ایک مسلمان نے دوسرے مسلمان سے کہا کہ اگر تم قرآن ہاتھ میں لے کر کہہ دو کہ یہ جائداد میری ہے، تو میں اس کو تمہارے حوالے کر دوں گا۔ مذکورہ مسلمان نے اس سے انکار کیا۔ اس نے کہا ——— اس میں قرآن کہاں سے آگیا۔

موجودہ زمانہ میں یہی بیشتر مسلمانوں کا حال ہے۔ وہ قرآن کو مانتے ہیں۔ اس کا احترام بھی کرتے ہیں۔ مگر صرف اس وقت تک جب کہ قرآن ان کے ذاتی معاملات سے تعرض نہ کرے۔ جیسے ہی قرآن کی زد ان کے ذاتی معاملات پر پڑے وہ فوراً قرآن کو چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسے موقع پر ان کی نفسیات یہ ہوتی ہے کہ میرے ذاتی معاملات تو میری اپنی پسند ناپسند کے تابع ہیں۔ اس کا قرآن و حدیث سے کیا تعلق۔ یہ غیر قرآنی مزاج صرف عوام میں نہیں بلکہ علما اور اسلام پسند طبقہ میں بھی وہ یکساں طور سے پایا جاتا ہے۔ آپ کسی بھی شخص سے ایک ایسے معاملہ میں بات کیجئے جس سے اس کا دنیوی انٹرسٹ وابستہ ہو، خواہ یہ انٹرسٹ مالی ہو یا اور کسی قسم کا ہو، آپ کو فوراً محسوس ہوگا کہ وہ اپنے اس معاملہ میں قرآن و سنت کی بالادستی ماننے کے لئے تیار نہیں۔ حتی کہ جو لوگ اسلام پر تقریریں کرنے ہی کو اپنا مشغلہ بنائے ہوئے ہیں، وہ بھی اپنے ذاتی معاملہ کو اس سے الگ رکھنا چاہتے ہیں۔

لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ اہتمام کے ساتھ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں۔ وہ پیغمبر اسلام کے ساتھ گستاخی کرنے والے کے خلاف "زمین شش شد و آسمان ہفت شد" کا ہنگامہ کھڑا کرنے کے لئے تیار ہیں۔ مگر اپنی رائے کو قرآن و حدیث کے تابع کرنا انھیں گوارا نہیں۔ اپنی ذات کے معاملہ میں قرآن و سنت کے احکام کو منطبق کرنا ہو تو وہ کسی قیمت پر اس کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔

قرآن کے مطابق، کسی آدمی کے مومن ہونے کا معیار یہ ہے کہ وہ باہمی نزاع میں اللہ اور رسول کے فیصلہ کے آگے سر جھکا دے (النساء ۶۵) مگر لوگوں نے بطور خود اس کا کچھ اور معیار مقرر کر لیا ہے۔ یہ بلاشبہ سرکشی ہے نہ کہ اسلام۔

شعور کی اہمیت

شہر میں ایک آدمی کے پاس گھر نہیں تھا۔ وہ دن بھر کماتا اور شام کو فٹ پاتھ پر سو جاتا۔ کبھی کوئی سایہ دار جگہ تلاش کر کے وہاں رات گزارنے کی کوشش کرتا۔ اس زمانہ میں اس کا تقویٰ بہت بڑھا ہوا تھا۔ اس کی نماز خشوع سے بھری ہوئی تھی۔ وہ دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتا تو آنسوؤں سے اس کی داڑھی تر ہو جاتی۔ وہ ہر وقت خدا کو اس طرح یاد کرتا جیسے کہ وہ خدا کے بالکل قریب پہنچ گیا ہے۔

آخر چند سال بعد اس کے پاس ایک ذاتی مکان ہو گیا۔ بجلی اور پانی کی سہولت بھی اس کو حاصل ہو گئی۔ یہاں تک کہ مزید کمائی کر کے اس نے اپنے گھر میں ٹیلیفون لگوالیا اور اسی طرح دوسری چیزیں بھی۔ یہ سب تو ہوا مگر دھیرے دھیرے اس کا تقویٰ ختم ہو گیا۔ اب اس کی آنکھ کے آنسو خشک ہو گئے۔ خدا کی دردبھری یاد اس سے رخصت ہو گئی۔ اس نے اپنے لئے ایک گھر تو پالیا مگر اس نے اپنے خدا کو کھو دیا۔

ایسا کیوں ہوا۔ اس کی وجہ شعور کی کمی تھی۔ مذکورہ آدمی اپنی بے شعوری کی بنا پر اس وقت اپنے کو غیر محفوظ سمجھتا تھا جب کہ اس کے پاس ذاتی گھر نہیں تھا۔ ذاتی گھر ملنے کے بعد اس کا احساس یہ ہو گیا کہ اب مجھے محفوظ زندگی حاصل ہو گئی ہے۔ کیوں کہ اب میرے پاس اپنا ذاتی مکان ہو گیا ہے۔ مکان ملنے سے پہلے وہ اپنے آپ کو عاجز محسوس کرتا تھا اس لئے اس کے اندر تقویٰ کی کیفیت بھی اعلیٰ درجہ میں ابھری ہوئی تھی۔ مگر مکان ملنے کے بعد اس کا احساس عجز جاتا رہا، اس لئے تقویٰ کی کیفیت بھی اس سے رخصت ہو گئی۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ زندگی کی سہولتیں ناجائز یا قابل ترک ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس آدمی کے ساتھ فرق کا یہ معاملہ بے شعوری کی بنا پر پیش آیا۔ اس کا سبب خارجی سامان حیات میں نہ تھا بلکہ خود اس آدمی کے اپنے دماغ میں تھا۔ اس کا سبب اس کے شعور کی ناپختگی تھی۔ اگر وہ پختہ شعور والا ہوتا تو وہ اس انجام سے دوچار نہ ہوتا۔

اس آدمی کا شعور اگر بڑھا ہوا ہوتا تو اس کو معلوم ہوتا کہ بظاہر محفوظ زندگی حاصل کرنے کے باوجود

وہ غیر محفوظ ہے۔ اچھے گھر کا مالک ہونے کے باوجود اب بھی وہ اتنا ہی عاجز ہے جتنا کہ وہ پہلے عاجز تھا۔ عجز و افتقار کے اعتبار سے اس کی زندگی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔

ایک گھر یا ایک محل تو بہت چھوٹی چیز ہے۔ اگر پوری کی پوری زمین کسی آدمی کے قبضہ میں آجائے تب بھی اس کا عجز مکمل طور پر باقی رہے گا۔ کیوں کہ زمین کیا ہے۔ زمین ایک وسیع خلا میں معلق ہو کر سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔ اس معلق زمین کو سنبھالنے والا کوئی انسان نہیں۔ انسان کی طاقت سے باہر ہے کہ وہ زمین کو سنبھال سکے۔

جس طرح ایک گھر کو سنبھالنے والا خدا ہے، اسی طرح یہ صرف خدا ہے جو اس پوری زمین کو اپنی غیر معمولی طاقت کے ذریعہ سنبھالے ہوئے ہے۔ خدا اگر ایک لمحہ کے لئے اپنی قیومیت واپس لے لے تو زمین اور اس کے تمام باشندے تباہ ہو کر رہ جائیں۔

آدمی اگر خدا اور عالم فطرت کو جانے۔ اس کے اندر حقیقت واقعہ کا گہرا شعور ہو تو اس کا احساس عجز ہر حال میں باقی رہے گا۔ وہ محل کے اندر بھی اپنے آپ کو اتنا ہی عاجز محسوس کرے گا جتنا کہ کسی درخت کے نیچے۔ اور جب احساس عجز باقی رہے گا تو تقویٰ بھی بدستور باقی رہے گا، وہ کسی حال میں اس سے رخصت نہ ہوگا۔

اعلیٰ دینداری اعلیٰ شعور کے بغیر ممکن نہیں۔ جو لوگ کمتر شعور کے ساتھ دیندار بنیں ان کا حال بہت جلد مذکورہ آدمی جیسا ہو جائے گا۔ وہ دینی تڑپ کے ساتھ اپنی زندگی کا آغاز کریں گے اور پھر ایک بے تڑپ حیوان بن کر دنیا میں باقی رہ جائیں گے۔

نتیجہ خیز عمل

ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے سوال کیا کہ ہندستانی مسلمانوں کے مسائل کا حل کیا ہے۔ میں نے کہا کہ صبر۔ انھوں نے کہا کہ صبر کا کیا مطلب ہے۔ میں نے کہا کہ صبر کا مطلب ہے —— مسائل کو نظر انداز کر کے مواقع کو استعمال کرنا۔

انھوں نے کہا کہ میں مانتا ہوں کہ صبر کا حکم قرآن میں ہے۔ مگر صبر کوئی مطلق چیز نہیں۔ جب کھلم کھلا اشتعال انگیزی کی جائے۔ جب ہم صاف طور پر دیکھیں کہ مسلمانوں کے اوپر زیادتی کی جارہی ہے تو اس وقت صبر کیسے کیا جائے گا۔ ایسی حالت میں صبر کرنا تو بزدلی اور شکست خوردگی کے ہم معنی ہوگا۔

میں نے کہا کہ آپ نے صبر کا معیار غلط قائم کیا ہے۔ صبر کے اختیار یا ترک کا معیار یہ نہیں ہے کہ صبر کرنے میں آپ کو بزدلی یا شکست خوردگی نظر نہ آئے تو آپ صبر کریں اور جب صبر کا طریقہ آپ کو بزدلی اور شکست خوردگی دکھائی دے تو آپ صبر کو چھوڑ دیں۔ یہ جذباتیت ہے، جب کہ معیار ہمیشہ اصولی بنیاد پر طے کیا جاتا ہے۔

صبر کا حقیقی معیار صرف ایک ہے، اور وہ رزلٹ (نتیجہ) ہے۔ صبر کا اصول صرف اس وقت توڑا جاسکتا ہے جب کہ اس میں کوئی مثبت نتیجہ ملنے والا نہ ہو۔ بصورت دیگر، صبر کی روش پر قائم رہنا ضروری ہوگا۔ خواہ بظاہر وہ بزدلی اور شکست خوردگی کیوں نہ دکھائی دیتا ہو۔

قدیم مکہ میں مسلمانوں کے خلاف ہر طرح کی اشتعال انگیزی جاری تھی۔ ہر قسم کا ظلم ان پر کیا جارہا تھا۔ حضرت عمر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ان ظالموں کے خلاف جہاد کیا جائے۔ آپ نے فرمایا کہ اے عمر ابھی ہم تھوڑے ہیں (یا عمر انا قلیل) گویا مسلمان جب قلیل ہوں اور فریق مخالف کثیر ہو تو ظلم کے باوجود ٹکراؤ کا طریقہ اختیار نہیں کیا جائے گا۔ کیوں کہ ایسے اقدام کا کوئی فائدہ نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں صرف اسی اقدام کی اجازت ہے جو نتیجہ خیز ہو۔ جو اقدام بے نتیجہ ہو کر رہ جائے یا جس اقدام کا الٹا انجام نکلنے والا ہو، وہ سنت رسول کے خلاف ہے۔ اور جو عمل سنت رسول کے خلاف ہو وہ بلاشبہ اللہ کے یہاں غیر مقبول قرار پائے گا۔ نتیجہ کو سامنے رکھ کر اپنا رویہ مقرر کرنا اسلام ہے، اور نتیجہ سے بے پروا ہو کر جوش و جذبہ کے تحت اقدام کرنا جاہلیت۔

تجارتی شعور

دہلی کے ایک مسلمان ہیں جو کامیاب موٹر میکینک سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی کامیابی کا راز کیا ہے، اس کا اندازہ ان کے ایک واقعہ سے ہوتا ہے:

۱۹۸۲ میں یہ خبر پھیلی کہ جلد ہی جاپانی کمپنی سوزوکی کی بنائی ہوئی ماروتی کار بازار میں آنے والی ہے۔ مذکورہ مسلمان کے دماغ میں فوراً یہ بات آئی کہ جب ماروتی گاڑی انڈیا کی سڑکوں پر دوڑنے لگے گی تو ساتھ ہی اس کی سروس اور مرمت کا کام بھی شروع ہو جائے گا۔ اس وقت جو آدمی اس کام کو جانتا ہو گا وہ یقیناً بہت کامیاب رہے گا۔

مذکورہ مسلمان کو معلوم تھا کہ جاپان کی سوزوکی کمپنی پچھلے دس سال سے پاکستان میں یہی گاڑی بنا کر بیچ رہی ہے۔ وہاں کی سڑکوں پر ہزاروں کی تعداد میں یہ گاڑیاں چل رہی ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اس کا کام سیکھنے کے لئے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ دہلی سے کراچی گئے۔ وہاں وہ دو مہینہ رہ کر سوزوکی کار کی مرمت اور سروس کا کام سیکھتے رہے۔ اور پھر دوبارہ دہلی واپس آگئے۔

ہندستان میں بنی ہوئی ماروتی گاڑی جب یہاں کی سڑکوں پر چلنے لگی، اس وقت وہ اس کا کام سیکھ چکے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ماروتی کا کام لینا شروع کر دیا۔ گاہکوں کو ان کا کام پسند آگیا۔ انھوں نے ماروتی کار کی سروس میں کافی پیسے کمائے۔

غور کیجئے تو مذکورہ مسلمان کی اس کامیابی میں تین چیزیں شامل ہیں ــــــ واقفیت، پیش بینی، اور اقدام۔ وہ اس سے واقف تھے کہ پاکستان میں سوزوکی کمپنی کی گاڑیاں چل رہی ہیں۔ پھر انھوں نے پیشگی طور پر یہ اندازہ کیا کہ جلد ہی ہندستان میں ان گاڑیوں کی سروس اور مرمت کا کام شروع ہونے والا ہے۔ پھر ان کے اندر یہ جرأت تھی کہ وہ اس کی طرف اقدام کر سکیں۔

انھیں اوصاف کا نام تجارتی شعور ہے۔ اور جس آدمی کے اندر یہ تجارتی شعور ہو وہ اس دنیا میں کامیاب ہو کر رہتا ہے۔ کامیابی ایک ففٹی ففٹی کا معاملہ ہے۔ اس کا تعلق پچاس فیصد امکانات سے ہے، اور پچاس فیصد اس کو استعمال کرنے کی صلاحیت سے۔

ہندستانی قومیت

ہندستانی قومیت کی تشکیل کس طرح ہوتی ہے (what constitutes Indian nationalism)

یہ اس وقت ہماری گفت گو کا موضوع ہے۔ یہ سوال بلاشبہ نہایت اہم قومی سوال ہے۔ اس سوال کے حل پر ملک کی تعمیر و ترقی کا انحصار ہے۔ اس اعتبار سے اس سوال کو ۱۹۴۷ ہی میں آخری طور پر طے ہو جانا چاہیے تھا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ آج بھی اس سوال پر بحث جاری ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تقریباً نصف صدی گزرنے پر بھی اس سوال کا متفق علیہ جواب معلوم نہ کیا جا سکا۔

اس غیر معمولی تاخیر کا سبب کیا ہے۔ میرے نزدیک اس کا بنیادی سبب ہے —— ایک چیز اور دوسری چیز کے فرق کو ملحوظ نہ رکھنا۔ سماجی زندگی میں ہمیشہ کچھ چیزیں نیشنل (مشترک) ہوتی ہیں، اور کچھ چیزیں پرائیویٹ (غیر مشترک) نیشنل حصہ میں یکسانیت مطلوب ہوتی ہے، اور پرائیویٹ حصہ میں تعدد۔ نیشنل معاملات کو اگر ہر آدمی کے ذوق پر چھوڑ دیا جائے تو ملک تباہ ہو جائے گا۔ اسی طرح پرائیویٹ حصہ میں اگر تمام لوگوں کو ایک روش پر قائم کرنے کی کوشش کی جائے تو سارا سماج انتشار کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔

اس مسئلہ کے الجھاؤ کے ذمہ دار مختلف فرقوں کے وہ پرجوش لوگ ہیں جو دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہ رکھ سکے۔ انھوں نے یہ غلطی کی کہ ایک نیشنل معاملہ کو پرائیویٹ بنانے کی کوشش کی، اور ایک معاملہ جو پرائیویٹ تھا اس کو نیشنل درجہ دینے پر اصرار کیا۔ اس قسم کی غیر فطری اور غیر حقیقت پسندانہ کوشش صرف انتشار پیدا کر سکتی تھی، اور اس نے صرف وہی پیدا کیا۔

مثال کے طور پر ہمارے جن لیڈروں نے "کامن سول کوڈ" کی دفعہ دستور ہند میں شامل کی، انھوں نے ایک پرائیویٹ معاملہ کو نیشنل بنانے کی کوشش کی، کیوں کہ شادی بیاہ یا نکاح وطلاق کا معاملہ لوگوں کی پرائیویٹ زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ ہر ایک کا انفرادی معاملہ ہے نہ کہ پورے ملک کا قومی معاملہ۔ اسی غلطی کا یہ نتیجہ ہے کہ اس دستوری دفعہ نے غیر ضروری بحث پیدا کرنے کے سوا اب تک کچھ اور نہیں کیا۔

اسی طرح کچھ مسلمان پاکستان کی جیت پر خوشی مناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پاکستان ایک مسلم ملک ہے، اس بنا پر یہ ہمارے لیے ایک جذباتی مسئلہ ہے۔ مگر یہ نیشنل معاملہ کو پرائیویٹ معاملہ بنانا

ہے۔ انڈیا ہمارا وطن ہے۔ جب بھی انڈیا کا مقابلہ کسی دوسرے ملک سے ہوگا، خواہ وہ کرکٹ کے میدان میں ہو یا جنگ کے میدان میں، تو ہمارے جذبات لازمی طور پر اپنے وطن کے ساتھ ہوں گے۔ اس معاملہ میں انفرادی روش ہرگز قابل برداشت نہیں ہو سکتی —— نان کامن کو کامن بنانا جتنا غلط ہے اتنا ہی کامن کو نان کامن بنانا بھی غلط ہے۔

اس مسئلہ کو سادہ اور فطری طور پر سمجھنے کی آسان صورت یہ ہے کہ اس کو خاندان کی سطح پر دیکھا جائے۔ خاندان کسی قوم کی ابتدائی یونٹ ہوتا ہے۔ بہت سے خاندان کے مجموعہ ہی کا نام نیشن ہے۔ اب دیکھئے کہ خاندان کی سطح پر اس مسئلہ کی نوعیت کیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ خاندان کی سطح پر ہمیشہ کچھ باتیں کامن انٹرسٹ کی ہوتی ہیں۔ ان میں ہر فیملی ممبر کی رائے صرف ایک ہوتی ہے۔ اور ان کے علاوہ کچھ چیزیں انفرادی ٹیسٹ کی ہوتی ہیں۔ ان میں ہر فیملی ممبر کی سوچ الگ الگ ہوتی ہے۔

کامن انٹرسٹ میں مثال کے طور پر ایک اہم چیز معاشی یا مالی انٹرسٹ ہے۔ وہ چیزیں جو فیملی کے معاشی انٹرسٹ سے تعلق رکھتی ہوں ان میں ہر ایک کی سوچ بالکل یکساں ہوتی ہے۔ ایسے معاملات میں فیملی کے تمام ممبر بلا اختلاف ایک ہی نقطۂ نظر کو اپنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایسے معاملات میں اگر کئی نقطۂ نظر چلایا جائے تو خود فیملی کا وجود ہی خطرہ میں پڑ جائے گا۔

مگر جہاں تک انفرادی ٹیسٹ کا معاملہ ہے، تو یہاں ہر ایک کا کیس الگ الگ بن جاتا ہے۔ مثلاً کوئی ایک قسم کا کھانا پسند کرتا ہے اور کوئی دوسرے قسم کا کھانا۔ کوئی ویسٹرن لباس پہنتا ہے اور کوئی ایسٹرن لباس۔ کسی کو ادب سے لگاؤ ہوتا ہے اور کسی کو سائنس سے۔ کوئی کٹر مذہبی ہوتا ہے اور کوئی مذہب کے معاملہ میں لبرل ہوتا ہے۔ کسی کو ایک رنگ کا فرنیچر پسند ہوتا ہے اور کسی کو دوسرے رنگ کا فرنیچر۔ وغیرہ۔

اسی دوگانہ اصول پر تمام خاندانوں کا نظام چل رہا ہے۔ خواہ وہ ہندو خاندان ہو یا مسلم خاندان، یا اور کسی کمیونٹی سے تعلق رکھنے والا خاندان۔ ہر ایک کے لیے فطرت کا یہی اصول ہے، اور دنیا میں ہر جگہ یہی اصول کارفرما ہے۔

نومبر ۱۹۹۱ میں شولاپور (مہاراشٹر) میں قومی ایکتا کے موضوع پر ایک سیمینار تھا۔ اس میں مجھے شریک ہونے کا اتفاق ہوا۔ اس موقع پر مقامی ایم ایل اے شری تلسی داس جادھو نے بھی

تقریر کی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں نے اپنے گھر میں دیکھا ہے کہ میرے باپ نان ویجیٹیرین تھے۔ میری ماں کٹر قسم کی ویجیٹیرین تھی۔ اس کے باوجود دونوں میں کبھی کوئی اختلاف نہیں ہوا۔ میں نے سالہا سال تک دیکھا ہے کہ میری ماں صبح اٹھ کر پہلے میرے باپ کے لیے میٹ بناتیں اور اس کو کھانے کی میز پر رکھ دیتیں۔ اس کے بعد وہ غسل خانہ میں جاکر نہاتیں اور پھر اپنے لیے دال سبزی والا کھانا بناتیں۔

میری ماں اسی طرح آخر عمر تک کرتی رہیں۔ کھانے کے معاملہ میں دونوں کے درمیان اتنا بڑا فرق تھا۔ مگر اس سوال پر دونوں میں کبھی جھگڑا نہیں ہوا۔ دونوں زندگی بھر عزت اور محبت کے ساتھ مل کر رہتے رہے۔

یہی معاملہ ہر فیملی کا ہے۔ ہر فیملی میں کچھ چیزیں مشترک ہوتی ہیں اور کچھ چیزیں غیر مشترک۔ مشترک حصہ سے مراد وہ چیزیں ہیں جو سب سے یکساں طور پر تعلق رکھتی ہیں۔ مثلاً خاندان کی عزت، خاندان کا کاروبار، خاندان کی ترقی، خاندان کا تحفظ۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو خاندان کے ہر فرد کا مشترک کنسرن ہوتی ہیں۔ ان چیزوں میں فیملی کے ایک فرد اور فیملی کے دوسرے فرد میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

خاندانی زندگی کا دوسرا حصہ وہ ہے جو غیر مشترک ہوتا ہے۔ اس میں ہر آدمی اپنے اپنے ذوق پر چلتا ہے۔ یہ غیر مشترک حصہ ہے —— کھانا پینا، لباس، تفریحات، شخصی عادتیں، وغیرہ۔ زندگی کا فطری اصول یہ ہے کہ مشترک امور میں تمام افراد کو ایک نقطۂ نظر کا پابند کیا جائے۔ مگر غیر مشترک امور میں ہر ایک کو آزادی دیدی جائے کہ وہ اپنی ذاتی پسند سے جو روش چاہیں اختیار کریں۔ وحدت کے ساتھ تنوع، اور تنوع کے ساتھ وحدت کے اسی اصول میں کسی سماج کی کامیابی کا راز چھپا ہوا ہے۔

خاندان ہی جیسا معاملہ بڑے پیمانہ پر قوم کا بھی ہے۔ یہاں بھی ایک قومی انٹرسٹ ہے، اور دوسرا انفرادی انٹرسٹ۔ اگر ان دونوں کی علاحدہ علاحدہ رعایت کی جائے اور ان میں کنفیوژن نہ کیا جائے تو نیشن کا معاملہ درست طور پر چلتا رہے گا۔ اور اگر دونوں کے فرق کو نظر انداز کر دیا جائے اور غیر ضروری طور پر نظریاتی رولر چلا کر دونوں کو ایک کرنے کی کوشش کی جائے تو اس کے بعد یہ مسئلہ سادہ طور پر ایک سماجی مسئلہ نہیں رہتا، بلکہ وہ ایسے میدان جنگ کا مسئلہ بن جاتا ہے جو کبھی حل نہ ہو سکے۔

خاندان رشتہ داری کی بنیاد پر بنتا ہے اور قوم وطن کی بنیاد پر بنتی ہے۔ قومیت کا سادہ اصول یہ ہے کہ ایک زمینی خطہ میں جو لوگ رہتے ہیں وہ سب ایک قوم ہیں۔ مثلاً انڈیا میں جو ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، رہتے ہیں وہ سب کے سب ایک قوم ہیں۔ خواہ اس واحد قوم کو ہندستانی کہا جائے یا اس کو انڈین یا بھارتی کا نام دیا جائے۔

ہندستانی قومیت کے اس انسانی مجموعہ میں ایک چیز کامن ہے، اور اسی کے ساتھ کچھ چیزیں ایسی ہیں جو انفرادی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ چیزیں جن کا تعلق انڈیا کی انٹگریٹی یا اس کے مجموعی مادی انٹرسٹ سے ہو، اس میں اس خطۂ ارض میں بسنے والے ہر آدمی کا نقطۂ نظر ایک ہوگا۔ مثلاً کشمیر کا مسئلہ کسی مسلمان کے لیے مسلم مسئلہ نہیں ہوگا بلکہ وہ اس کے لیے صرف انڈین مسئلہ ہوگا۔ اسی طرح پنجاب کا مسئلہ کسی سکھ کے لیے سکھ مسئلہ نہیں ہوگا بلکہ وہ اس کے لیے انڈین مسئلہ ہوگا۔ اسی طرح آسام کا مسئلہ کسی کرسچین کے لیے کرسچین مسئلہ نہیں ہوگا بلکہ وہ اس کے لیے انڈین مسئلہ ہوگا۔ اسی طرح وہ تمام مسائل جن سے ملک کا مجموعی سیاسی، معاشی، جغرافی انٹرسٹ وابستہ ہو، ان میں کسی بھی فرد یا کمیونٹی کی سوچ علاحدہ نہیں ہوگی۔

مگر اس مشترک نیشنل انٹرسٹ کے باہر بہت سی چیزیں ہیں جن کا تعلق انفرادی ذوق سے ہے۔ ان دوسرے پہلوؤں میں ہر ایک کو اپنے نجی دائرہ میں آزادی حاصل ہوگی۔ مثلاً مذہب، خوراک، لباس، زبان، رہن سہن، شادی بیاہ، جیسے معاملات میں ہر ایک کو اپنے محدود دائرہ میں آزادی ہوگی کہ وہ اپنی انفرادی پسند کے مطابق جو انداز چاہے اس کو اختیار کرے۔ یہی طریقہ آج تمام ترقی یافتہ ملکوں میں رائج ہے۔

اس انفرادی آزادی پر اگر کوئی شرط لگائی جاسکتی ہے تو وہ صرف یہ کہ کسی کو اپنی آزادی اس حد تک نہیں بڑھانا چاہیے کہ وہ دوسرے کی آزادی میں خلل اندازی کا سبب بن جائے۔ اس معاملہ میں وہی اصول صادق آتا ہے جو ایک امریکی شہری نے راستہ پر چلنے والے اپنے ایک ہم وطن سے اس وقت کہا تھا جب کہ اس نے اپنی آزادی کا غلط استعمال کرتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کی ناک پر مار دیا تھا۔ اس نے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ تم کو آزادی حاصل ہے۔ مگر تمہاری آزادی وہاں ختم ہو جاتی ہے جہاں سے میری ناک شروع ہوتی ہے:

Your freedom ends where my nose begins.

اس معاملہ کی وضاحت کے لیے میں ایک ذاتی مثال دوں گا۔ ۱۹۷۱ کے آغاز میں میں پاکستان (لاہور، فیصل آباد) گیا۔ یہ سفر میں نے بذریعہ ٹرین کیا تھا۔ ہندستانی سرحد پار کرنے کے بعد جب میں پاکستان کی سرزمین میں داخل ہوا تو ایک فوجی افسر مجھے اپنے خیمہ کے اندر لے گیا۔ یہ وقت وہ تھا جبکہ بنگلہ دیش کے مسئلہ کی وجہ سے انڈیا اور پاکستان میں سخت تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔

اس بند خیمہ میں پاکستانی فوج کے افسر نے مجھ سے ایسی گفتگو شروع کی جو میرے نزدیک انڈیا کے نیشنل انٹرسٹ کے خلاف تھی۔ کچھ دیر تک میں برداشت کرتے ہوئے اس کی باتیں سنتا رہا۔ پھر میں نے غضب ناک لہجہ میں کہا: "جناب، آپ مجھ سے یہ سمجھ کر بات کریں کہ میں انڈیا کا ایک لائل سیٹیزن ہوں۔" اس کے بعد میں نے تقریباً پندرہ منٹ تک نہایت سخت انداز میں اس کے سامنے تقریر کی۔ میں جانتا تھا کہ اس وقت اگر وہ مجھے گولی مار دے تو یہاں مجھے کوئی بچانے والا نہ ہوگا۔ مگر صورت حال کی نزاکت کی پروا کیے بغیر میں نے اس سے وہ سب کچھ کہہ ڈالا جو ایک ہندستانی شہری کی حیثیت سے میں کہہ سکتا تھا۔ اور پھر معذرت کیے بغیر خیمہ سے باہر نکل آیا۔

جس وقت میں نے پاکستان کے فوجی افسر سے یہ باتیں کہیں اس وقت میرا مذہب، میرا لباس، میری بولی، میری خاندانی روایات، سب کچھ ایک عام ہندو سے مختلف تھیں۔ مگر قومی احساس کے اعتبار سے اس وقت میرا احساس عین وہی تھا جو ایک دیش بھگت ہندو کا احساس ہو سکتا ہے۔

تنوع کے ساتھ اتحاد (unity in diversity) کا یہی اصول میرے نزدیک انڈین نیشنلزم کی اصل بنیاد ہے۔ شخصی نوعیت کے محدود امور میں ہم ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے۔ مگر قومی اعتبار سے ہم سب کا اجتماعی تصور ایک ہوگا۔ یہی ممکن بھی ہے اور یہی عقل کے مطابق بھی۔

خلاصہ یہ کہ ہمالیہ پہاڑ اور بحر ہند کے درمیان واقع زمینی خطہ جس کو ہمارے دستور نے "انڈیا" کے طور پر ڈیفائن کیا ہے، اس میں بسنے والا ہر آدمی انڈین ہے۔ یہ سب کے سب لوگ ایک قوم ہیں۔ سب کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک ہی قومی سوچ کو اپنی شناخت بنائیں اور باہم مل جل کر زندگی گزاریں۔

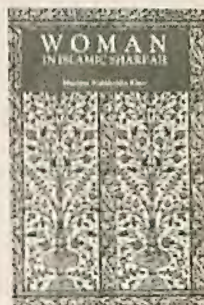
مگر اس وسیع قومی مجموعہ کے اندر جو افراد آباد ہیں، اپنے نجی دائرہ میں ان کا طرز زندگی (mode of life) یکساں نہیں ہو سکتا۔ اور نہ کسی بھی ملک میں وہ یکساں ہے۔ پہلے دائرہ کے لیے فطرت کا تقاضا ہے کہ سب کا طرز فکر ایک ہو۔ مگر عین اسی فطرت کا یہ تقاضا بھی ہے کہ نجی دائرہ میں ان

کے درمیان تنوع پایا جائے۔ ایک ماں باپ سے پیدا ہونے والے چار بھائی خاندان کے مشترک مفاد کے معاملہ میں تو ایک مشترک طرزِ فکر کے حامل ہوتے ہیں۔ مگر ذاتی دائرہ میں چاروں بھائیوں کا مزاج اور چاروں بھائیوں کی پسند الگ الگ بن جاتی ہے۔

معلوم ہوا کہ وہ چیز جس کو ہم انڈین نیشن کہتے ہیں، اس کے دو دائرے ہیں۔ ایک دائرہ میں یکسانیت مطلوب ہے اور دوسرے دائرہ میں تنوع۔ یکسانیت والے دائرہ میں تفرق برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ مگر تنوع والے دائرہ کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ یہاں کامیاب زندگی حاصل کرنے کا راز صرف ایک ہے، اور وہ ہے ایک دوسرے کے درمیان فرق کو ٹالریٹ کرنا۔ پہلے معاملہ میں اگر "من تو شدم تو من شدی" کا اصول کارفرما ہے تو دوسرے معاملہ میں Let us agree to disagree کا اصول۔

ہندستانی قومیت کی کامیاب تعمیر اسی وقت ممکن ہے جب کہ ان دونوں حصوں کے فرق کو سمجھتے ہوئے ہر ایک کی صحیح رعایت کی جائے۔ پہلے دائرہ میں علاحدگی پسندی اگر اتنی بری چیز ہے جس کو قومی غداری کہا جائے تو دوسرے دائرہ کے معاملہ میں برعکس طور پر Walt Whitman کا یہ قول صادق آتا ہے کہ میں اتنا زیادہ وسیع ہوں کہ ان تمام تضادات کو اپنے اندر سمو سکوں:

I am large enough to contain all these contradictions.



مطلوبِ فطرت

محمد یوسف صاحب ریاض میں رہتے ہیں۔ وہاں ان کا تعلق ایک بینک سے ہے۔ وہ اپنے خط مورخہ ۱۹ مارچ ۱۹۹۲ میں لکھتے ہیں :

"آپ کی کتاب اسلام دین فطرت پڑھی۔ صفحہ ۴۵-۴۶ پر آپ نے نماز سے متعلق جو بات لکھی ہے وہ بالکل سچ ہے۔ ۱۹۹۱ میں ایسا ہی ایک واقعہ عرب میں پیش آیا۔ ریاض کے انگریزی اخبار "عرب نیوز" میں اس کو میں نے پڑھا تھا، اس میں بتایا گیا تھا کہ ایک جرمن خاتون بطور نرس یہاں کے ایک اسپتال میں کام کرنے کے لئے آئی۔ یہاں رہتے ہوئے اس نے یہاں کے ماحول کو دیکھا جو اس کے ملک جرمنی کے ماحول سے مختلف تھا۔ وہ متاثر ہوئی اور پھر اس نے اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے خاوند کو جرمنی میں لکھا کہ میں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اگر تم بھی اسلام قبول کر لو تو ہم دونوں اکھٹے رہ سکتے ہیں۔ ورنہ تم مجھے طلاق دیدو۔ جرمن خاوند نے لکھا کہ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ تم فوراً وہاں کا کام چھوڑ کر جرمنی واپس آجاؤ۔ خاتون نے جواب میں لکھا کہ اب یہ ناممکن ہے۔ میرا اور تمہارا اب کوئی تعلق نہیں۔ آخر اس خاتون نے اپنے جرمن شوہر سے طلاق لے کر یہاں ایک مصری ڈاکٹر سے شادی کر لی۔ جب اس سے یہ پوچھا گیا کہ تم نے اسلام کیوں قبول کیا تو اس نے کہا کہ مسلمانوں کو نماز پڑھتے دیکھ کر"

اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں کہ نماز کو دیکھ کر لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز عبادت کا صحیح اور کامل فطری طریقہ ہے۔ پرستش کا جذبہ ہر آدمی کی فطرت میں پیشگی طور پر موجود ہوتا ہے۔ ہر آدمی عین اپنی فطرت کے تقاضے کے تحت چاہتا ہے کہ وہ اپنے رب کی عبادت کرے۔ اس کے بعد جب وہ کچھ لوگوں کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کے اندر کا فطری احساس کہتا ہے کہ یہ تو عین وہی چیز ہے جس کو میں چاہتا تھا۔ یہ احساس اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ نماز پڑھنے والوں کے ساتھ شامل ہو کر نماز پڑھنے والا بن جائے۔

نماز ہر انسان کا اپنا فطری مطلوب ہے۔ نماز اور انسان کے درمیان وہی نفسیاتی تعلق ہے جو پیاس اور پانی کے درمیان پایا جاتا ہے۔

ایک سفر

مراکو (المغرب) کی راجدھانی رباط میں ملک الحسن الثانی کی طرف سے ایک سالانہ پروگرام ہوتا ہے۔ یہ پروگرام ہر سال رمضان میں ہوتا ہے۔ اس میں مراکو اور عالم اسلام کے بڑے بڑے علماء شریک ہوتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ افطار سے ڈیڑھ گھنٹہ پہلے اہل علم بڑی تعداد میں قصر سلطانی میں جمع ہوتے ہیں۔ سلطان بذات خود بھی اس میں شرکت کرتے ہیں۔ ہر روز کوئی ایک عالم ۴۵ منٹ تک قرآن کی کسی آیت یا کسی حدیث کو عنوان بنا کر اس پر خطاب کرتا ہے۔ آخر میں ملک الحسن الثانی کی دعا پر اس کا اختتام ہوتا ہے۔ اس کو الدروس الحسنیہ کہا جاتا ہے۔

رمضان کے بعد ان خطابات کا مجموعہ مراکو کی وزارت اوقاف کی طرف سے چار زبانوں میں شائع کیا جاتا ہے ــــــ عربی، فرانسیسی، انگریزی، اسپینی۔ اس بار رمضان ۱۴۱۴ھ کے موقع پر مجھ کو دعوت نامہ ملا کہ اس پروگرام میں شرکت کروں اور ایک مقالہ وہاں پیش کروں۔ اس کے مطابق مراکو کا سفر ہوا۔ اس موقع کے لئے میں نے جو مقالہ تیار کیا وہ الیوم اکملت لکم دینکم کی قرآنی آیت پر مبنی تھا۔

۱۱ فروری ۱۹۹۴ کو صبح ۹ بجے کا وقت ہے۔ ابتدائی مراحل سے گزر کر میں دہلی انٹرنیشنل ایئر پورٹ کے گیٹ نمبر ۱ کے سامنے بیٹھا ہوں اور گیٹ کھلنے کا انتظار کر رہا ہوں۔ اتنے میں ایک مکھی آکر میرے اوپر بیٹھ گئی۔ مجھے یاد آیا کہ پچھلے مہینہ میں دو ہفتہ تک امریکہ میں رہا۔ مگر وہاں کسی بھی جگہ مجھے کوئی مکھی دکھائی نہیں دی۔ یہاں اندرا گاندھی ایئر پورٹ جیسے پرسٹیجس مقام پر بھی مکھی موجود ہے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ مکھی کو ختم کرنا کوئی بہت بڑا انسانی کارنامہ نہیں۔ مکھی گندگی کو صاف کرتی ہے، جب کہ انسان گندگی پھیلاتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو مکھی کو ختم کرنے والے اور مکھی کو ختم نہ کرنے والے دونوں کے درمیان بہت زیادہ فرق نہیں ملے گا۔ کیوں کہ دونوں ہی جگہ کا انسان ابھی اصل معاملہ میں بہت پیچھے ہے۔

دہلی سے پیرس کے لئے روانگی ایئر انڈیا کی فلائٹ ۱۴۹ کے ذریعہ ہوئی۔ یہ جہاز فرینک فرٹ ہوتے ہوئے پیرس جاتا ہے۔ قدیم زمانہ میں ۶۸۱۰ کیلومیٹر کا سفر نو گھنٹے میں طے کرنا ناممکن تھا۔ آج یہ ممکن ہو گیا ہے۔ عام طور پر اس کو ٹکنکل ترقی کا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر بہت کم ایسے لوگ ہونگے جو یہ سوچیں کہ یہ دراصل ان امکانات کا کارنامہ ہے جو فطرت کے اندر پہلے سے موجود تھے۔ انسان نے صرف یہ کیا کہ خدا کی دی ہوئی عقل سے ان کو دریافت کرکے انھیں استعمال کیا۔

دہلی سے جہاز کی روانگی کا وقت نو بجکر ۳۰ منٹ تھا۔ مگر جب جہاز دہلی سے اڑا تو گھڑی میں دس بجکر ۳۰ منٹ ہو چکے تھے۔ یہ مجھے اس بات کی قیمت ادا کرنی پڑی کہ میں نے "دلیش بھگتی" کی خاطر باہر کی کسی ایئر لائنز (مثلاً ایئر فرانس) سے سفر کرنے کے بجائے ایئر انڈیا کا انتخاب کیا۔ بیرونی ایئر کمپنیاں عام طور پر بالکل ٹھیک وقت پر سفر کرتی ہیں۔ لیکن ایئر انڈیا اور انڈین ایئر لائنز دونوں کے لئے تاخیر ایک معمول کی بات ہو گئی ہے۔ پرواز شروع ہوئی تو ایئر ہاسٹس نے اعلان کیا "ویمان کے لیٹ اڑانوں کے کارن اس دیری کے لئے ہم آپ سے چھما چاہتے ہیں"۔

میرے نزدیک اس قسم کی خرابیاں نہرو دور کی دین ہیں۔ نہرو کے سوشلزم نے ملک کو صرف ناقص کارکردگی اور کرپشن کا تحفہ دیا۔ سوشلزم یا اسٹیٹ کنٹرول والے سماج کا لازمی نتیجہ ہے، ذاتی محرک اور مقابلہ کے ماحول کا ختم ہو جانا۔ یہ فطرت کے قانون کے خلاف ہے۔ اور فطرت کے خلاف کوئی اسکیم کبھی مفید نہیں ہو سکتی۔ میرا ذاتی احساس یہ ہے کہ نہرو کے نام نہاد سوشلزم نے پچاس سال میں ہندستان کو اس سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے جتنا کہ انگریزوں نے دو سو سال کی مدت میں اس ملک کو پہنچایا تھا۔ تاہم یہ ایک امید کی بات ہے کہ موجودہ حکومت لبرلائزیشن کی پالیسی اختیار کرکے اس برائی کو ختم کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

"سر، آپ ہندی فلم دیکھیں گے یا انگلش فلم، کون سی فلم آپ کو دکھائیں" جہاز کے عملہ کے ایک صاحب نے پوچھا۔ میں نے کہا کہ نہیں، مجھے فلم نہیں دیکھنا ہے، میں تو یہ اخبارات پڑھوں گا۔ میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی، اس نے کم از کم تین بار مجھ سے یہی سوال کیا۔ آج کا انسان "منورنجن" کے لئے صرف ایک بات جانتا ہے اور وہ فلم ہے۔ اس کو علم نہیں کہ اس دنیا میں اس سے زیادہ بڑا ایک منورنجن ہے اور وہ علم ہے۔ علم کے اضافہ میں جو لذت ہے وہ کسی بھی دوسری چیز میں نہیں۔ اور

علم جب معرفت کے درجہ کو پہنچ جائے تو اس کی یہ لذت اتنی زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ اس کا کوئی حساب ہی نہیں۔

دوران سفر ایئر انڈیا کا فلائٹ میگزین نمسکار (جنوری۔ فروری ۱۹۹۴) دیکھا۔ اس میں ایک مضمون کا عنوان تھا: وطن کی طرف واپسی (The home coming)۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ گورنمنٹ آف انڈیا کی اکانومی کے لبرلائزیشن کی اسکیم اور ریڈ ٹیپ میں کمی اور پرمٹ راج کو ختم کرنے کی پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ نان ریزیڈنٹ انڈین کی واپسی کے لئے گویا فلڈ گیٹ کھل گیا ہے۔ ایک اندازہ کے مطابق، بیرونی ملکوں میں رہائش پذیر یہ ہندستانیوں کی تعداد ۱۲ ملین ہے۔ یہ لوگ تقریباً ۲۵ بلین ڈالر کی قابل سرمایہ کاری (investible) دولت رکھتے ہیں۔ اب تک یہ لوگ اپنی دولت باہر لگانا پسند کرتے تھے۔ مگر اب وہ ہندستان میں سرمایہ کاری سے خصوصی دلچسپی لے رہے ہیں۔

پچھلی نصف صدی میں بے شمار بیرونی دولت جو ملک میں آسکتی تھی وہ باہر کی باہر رہ گئی۔ وہ ہندستان کی خوش حالی میں اضافہ کا سبب نہ بن سکی۔ اس کی واحد وجہ ملکی صنعتوں کے لئے تحفظ (protection) کے نام پر بننے والے مصنوعی قوانین اور ضوابط تھے۔ ہندستان کی جدید اقتصادی تاریخ کا یہ واقعہ بتاتا ہے کہ اصلاح کے نام پر ہونے والا ایک عمل بھی کتنے بڑے فساد کا باعث ہوسکتا ہے۔ یہی اصلاحی فساد مزید اضافہ کے ساتھ خود مسلم رہنماؤں نے بھی ساری مسلم دنیا میں برپا کر رکھا ہے۔

جہاز میں کئی اخبار پڑھے۔ ہندی اخبار نوبھارت ٹائمس (۱۱ فروری ۹۴) بھی موجود تھا۔ کانپور کے فساد کی خبر کی سرخی یہ تھی: کانپور میں سینا تینات، ۱۵ تھانہ چھیتروں میں کرفیو۔ اس جملہ میں اردو کا تعینات ہندی میں جاکر تینات بن گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سماج کے مختلف طبقات کے میل جول سے زبانیں کس طرح بدلتی رہتی ہیں۔

یہی تبدیلی قدیم زمانہ میں مذہب کی مقدس کتابوں میں بھی ہوئی ہے۔ چنانچہ ہر مذہبی کتاب کے متن میں طرح طرح کے فرق واقع ہوگئے ہیں۔ حتی کہ بعض اوقات اس کا اصل ابتدائی مفہوم ہی خبط ہو کر رہ گیا ہے۔ مثال کے طور پر بائبل میں بہت سے ایسے الفاظ ہیں جن کے واقعی معنی معلوم نہیں۔ ان کا مفہوم صرف اٹکل سے قائم کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب: Historical Jesus

اس عمومی تاریخی ظاہرہ میں صرف ایک استثنا ہے اور وہ قرآن ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کے نزول کے وقت ہی سے اس کی کتابت اور حفظ دونوں کا اہتمام کیا گیا۔ اس طرح قرآن میں مذکورہ قسم کی تبدیلی نہ ہو سکی۔

ایک ایئر ہاسٹس نے اپنا نام مسز اشرفی بتایا اور کہا کہ وہ ایک مسلم پیر کی مرید ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کی جو سروس ہے وہ آپ کے لئے بورنگ ہے یا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ ہمارے لئے تو یہ کام ایک ہابی بن چکا ہے۔ میں نے کہا کہ مگر میرا حال تو یہ ہے کہ میں فرسٹ کلاس کے سفر میں بھی سخت اکتاہٹ میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ ایک جگہ بیٹھے یا لیٹے رہتے ہیں۔ ہم کو تو ہر وقت حرکت میں رہنا پڑتا ہے۔ ہر وقت ہمارے سامنے کوئی کام ہوتا ہے۔ ہم لوگ کسی بھی وقت اپنے کو غیر مصروف نہیں پاتے۔

یہ بات مجھے درست نظر آئی۔ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے ہر وقت سرگرم رہنا چاہتا ہے۔ کسی آدمی کو آپ ایک کمرہ میں بند کر دیں تو خواہ اس کمرے میں عیش و عشرت کا تمام سامان موجود ہو، وہ بہت جلد گھبرا جائے گا۔ انسان حرکت و عمل کے ماحول میں زندہ رہتا ہے۔ اس کی فطرت چاہتی ہے کہ اس کے سامنے ہر وقت کوئی چیلنج یا کوئی عملی تقاضا موجود رہے جس میں لگ کر وہ محسوس کرے کہ میں نے ایک کام کیا۔ کسی فرد یا کسی قوم کو متحرک کرنے کا واحد راز یہ ہے کہ اس کو ایک پروگرام دے دیا جائے جس پر اس کو یقین ہو اور جس کے لئے وہ اپنی صلاحیت کو متحرک کر سکے۔

یہ ہوائی جہاز کا فرسٹ کلاس ہے۔ ہر قسم کے پر راحت سامان اس کے اندر افراط کے ساتھ موجود ہیں۔ تربیت یافتہ عورت اور مرد ہر وقت خدمت کے لئے حاضر ہیں۔ آپ صرف ایک بٹن دبا دیں اور ایک منٹ کے اندر ایک مستعد ایئر ہاسٹس آکر آپ کی ضرورت پوری کر چکی ہوگی۔ ایک عام آدمی ایسے حالات میں ہو تو اس کے چہرے پر سکون اور مسرت کی چمک واضح طور پر دکھائی دے گی۔ گویا کہ وہ زبان حال سے کہہ رہا ہو: میں اس وقت ایک آسمانی محل میں ہوں۔ میرا معاملہ وہ ہے جس کو شاعر نے ان لفظوں میں نظم کیا تھا:

فرحت و راحت و عشرت ہمہ فرماں بردار

مگر عین اس کے درمیان اللہ کا ایک بندہ سراپا اضطراب بنا ہوا ہے۔ اس کے سینہ میں بے چینی کا طوفان برپا ہے۔ کوئی راحت اس کے لئے راحت نہیں، سکون کی کوئی چیز اس کے لئے سکون بخش نہیں۔

اس انتہائی فرق کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ عام لوگوں کی نگاہ جہاز کے سامان پر ہے، اور اس بندۂ خدا کی نگاہ جہاز کی غیر محفوظیت (vulnerability) پر۔ کیوں کہ جہاز کے اندر خواہ عیش وعشرت کا کتنا ہی زیادہ سامان جمع کر دیا جائے، یہ حقیقت اپنی جگہ باقی رہتی ہے کہ وہ آخری حد تک غیر محفوظ ہے۔ کوئی بھی اتفاقی حادثہ حتی کہ فضا میں اڑتے ہوئے ایک گدھ کا اس سے ٹکرا جانا بھی پورے جہاز کی کامل تباہی کے لئے کافی ہے۔

یہی معاملہ زیادہ بڑے پیمانے پر خود موجودہ زمین کے اوپر انسان کا ہے۔ ہر آدمی یہاں اپنے لئے ایک کامیاب زندگی بنانے میں مصروف ہے۔ اگر جائز طریقے سے اس کے حوصلے پورے نہ ہو رہے ہوں تو وہ ناجائز طریقوں سے اپنے مقاصد کو سمیٹ لینا چاہتا ہے۔ کسی کو بھی اس حقیقت کی خبر نہیں کہ اس کے راحت کدہ سمیت پورا کرۂ ارض ہر آن ایک بھونچال کی زد میں ہے۔

نو گھنٹہ کی پرواز میں ۶۸۱۰ کیلو میٹر کا فاصلہ طے کر کے ہمارا جہاز فرینکفرٹ پہنچا۔ یہ ہمارے سفر کی پہلی منزل تھی۔ ہندستانی وقت کے لحاظ سے اس وقت ۱۱ فروری کے ساڑھے سات بجے کا وقت تھا، یہاں باہر کا ٹمپریچر چار ڈگری سلسیس تھا۔ ہر طرف بادل چھائے ہوئے تھے۔ اور بارش کا پانی جگہ جگہ دکھائی دے رہا تھا۔ جہاز کا پورا عملہ یہاں اتر گیا۔ اور دوسرا عملہ اس کی جگہ آگیا۔

فرینکفرٹ جرمنی کا صنعتی شہر ہے۔ فرینکفرٹ کی سڑکوں پر چلتے ہوئے ایک عظیم اور خوبصورت شہر کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ یہ جرمنی کی ترقی کی ایک علامت ہے۔ مگر اس ترقی کے پیچھے بہت سی ناخوشگوار باتیں چھپی ہوئی ہیں۔ انھیں میں سے ایک بے روزگاری ہے۔ ۸ فروری ۱۹۹۴ کو حکومت جرمنی کی طرف سے جو اعداد و شمار بتائے گئے ہیں ان کے مطابق اس وقت جرمنی میں بے روزگاروں کی تعداد چالیس لاکھ سے زیادہ ہے۔

انسانی صنعت کی ترقی اپنے ساتھ بہت سی ناپسندیدہ چیزیں لاتی ہے۔ مثلاً فضائی آلودگی،

بے روزگاری، وغیرہ۔ مگر اسی دنیا میں بہت بڑے پیمانے پر خدائی صنعت قائم ہے اور وہ کسی قسم کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرتی۔ آدمی اس حقیقت پر غور کرے تو بے اختیار وہ پکار اٹھے گا: فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

۱۱ فروری کی شام کو جہاز ابھی فرینکفرٹ میں کھڑا ہوا تھا۔ میں نے کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھا تو ہر طرف اندھیرا دکھائی دیا۔ میں نے سمجھا کہ سورج ڈوب چکا ہے۔ چنانچہ میں نے وضو کر کے مغرب کی نماز پڑھ لی۔ اس کے چند منٹ بعد جہاز اڑ کر اوپر فضا میں پہنچا تو اچانک نظر آیا کہ سورج آسمان میں چمک رہا ہے۔ یہ معاملہ گہرے بادلوں کی وجہ سے پیش آیا۔ چنانچہ ہمارے نیچے بھورے رنگ کے بادلوں کی گہری تہہ جمی ہوئی تھی۔ اوپر دن کا سماں تھا اور نیچے رات کا سماں۔ انسان کا مشاہدہ اکثر حالات میں کتنا زیادہ ناقص ہوتا ہے۔

فرینکفرٹ میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ قیام کے بعد آگے کے لئے روانگی ہوئی۔ یہ نسبتاً مختصر سفر تھا۔ جلد ہی ہمارا جہاز پیرس کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ یہاں میں ایئر انڈیا کے جہاز سے اتر کر باہر آگیا۔ کیوں کہ یہاں سے مجھے دوسرا جہاز لینا تھا۔

فرینکفرٹ سے پیرس کا سفر ۵۷۵ کیلو میٹر کا تھا جو ایک گھنٹہ میں طے ہوا۔ ایئر انڈیا والوں نے دہلی سے میسیج بھیج دیا تھا۔ چنانچہ میں جہاز سے باہر نکلا تو جہاز کے دروازہ پر ہی ایک فرانسیسی خاتون مجھے گائڈ کرنے کے لئے موجود تھیں۔ ان کے ساتھ کاؤنٹر پر آیا۔ کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھی ہوئی لیڈی نے پوچھا، کیا آپ کے پاس فرانس کا ویزا ہے۔ میں نے کہا ہاں۔ اس کے بعد میں نے پاسپورٹ نکال کر دکھانا چاہا تو اس نے فوراً کہا کہ بس، آپ کا کہہ دینا کافی ہے۔ یہ غیر ملک کا حال ہے۔ مگر یہی اعتماد خود اپنے ملک میں ہم کو حاصل نہیں۔ نئے ایئر پورٹ پر ہمیشہ کئی مراحل طے کرنے ہوتے ہیں۔ مگر ان لوگوں نے ہر کام بالکل مشین کی طرح انجام دیا۔ مجھے خود کچھ نہیں کرنا پڑا۔

میں نے سوچا کہ مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں میں جو اخلاقیات ہیں، اس کا راز کیا ہے۔ میری سمجھ میں آیا کہ یہ "مشین" کی روایات کا نتیجہ ہے۔ پچھلی صدیوں میں ان قوموں میں مشینی سائنس کا عمل بہت بڑے پیمانہ پر ہوا۔ اس کے دوران یہاں حقیقت پسندی اور واقعیت کی مشینی روایات قائم ہوگئیں جو اب تک چلی جارہی ہیں۔ صنعتی ملکوں کی اخلاقیات دراصل مشینی کارکردگی

کا انسانی اڈیشن ہیں۔ یہی اخلاقی ماحول خود ہندستان میں ۱۹۴۷ سے پہلے تھا۔ وہاں یہ اخلاق مذہبی عمل سے بننے والی روایات کے دوران قائم ہوا تھا۔ آزادی کے بھونچال میں ہمارے یہاں یہ روایات ٹوٹ گئیں۔ اس کے بعد کوئی نیا عمل جاری نہیں ہوا، جو روایت سازی کا کام کرنے والا ہو۔ چنانچہ پورا برصغیر ہند اعلیٰ روایات سے محروم ایک خطہ بن کر رہ گیا۔

پیرس ایرپورٹ پر ضروری کارروائی مکمل کرنے کے بعد مجھے ہلٹن ہوٹل جانا تھا جہاں ایرانڈیا نے میرے لئے ایک کمرہ رزرو کرادیا تھا۔ ۱۱ فروری کی شام کو مذکورہ فرانسیسی لیڈی نے کاؤنٹر کی کارروائی کے بعد مجھے ایک اور خاتون کے حوالے کیا اور کہا یہ آپ کو ایرپورٹ سے باہر لے جاکر ٹیکسی کا انتظام کریں گی۔ یہ خاتون ایرپورٹ کی عام خواتین سے کافی مختلف تھیں۔ انھوں نے بہت زیادہ ہمدردی کے ساتھ بقیہ مراحل طے کرائے۔ آخر وقت میں میں نے ان کا نام پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ سبینہ۔ میرا خیال ہے وہ کوئی مسلم خاتون تھیں۔ اگرچہ ان کے مذہب کے بارہ میں دریافت نہ کر سکا۔

ٹیکسی والا مجھ کو لے کر شہر کی طرف روانہ ہوا۔ سڑکیں نہایت عمدہ اور معیاری تھیں۔ سڑک کے دونوں طرف کے شہری مناظر نہایت گرینڈ اسکیل پر نظر آئے۔ میرا ذہن اس کا تقابل دہلی سے کر رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ پیرس کے مقابلہ میں دہلی کی شہری حیثیت ایسی ہی ہے، جیسے خود دہلی کے مقابلے میں ہندستان کے کسی چھوٹے شہر کی۔

دہلی میں مجھے بتایا گیا تھا کہ ہلٹن ہوٹل ایرپورٹ سے بہت قریب ہے۔ مگر کافی دیر ہو گئی اور ہوٹل ابھی تک نہیں آیا۔ ٹیکسی ڈرائیور مسلسل اپنی گاڑی دوڑائے چلا جا رہا تھا۔ میں نے اس سے انگریزی میں کہا کہ ہلٹن ہوٹل تو ایرپورٹ سے بہت قریب ہے، تم مجھ کو اتنی دور کہاں لے جا رہے ہو۔ وہ فرنچ میں جواب دینے لگا اور بالکل وہی کیفیت پیدا ہو گئی کہ زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم۔ میں نے بار بار کہا کہ انگلش۔ مگر وہ انگلش کے صرف کچھ الفاظ جانتا تھا۔ اس نے کہا: ہلٹن … اورلی … تھری زیرو … نوپرابلم … مسلم … احمدو … سینیگال۔ میں نے اس کے الفاظ کو جوڑ کر سمجھا کہ وہ کہہ رہا ہے ـــــ ہلٹن ہوٹل اورلی میں ہے۔ وہ یہاں سے ۳۰ میل دور ہے۔ میں وہیں جا رہا ہوں، کوئی فکر نہ کریں۔ میں مسلمان ہوں۔ میرا نام احمدو ہے۔ میں سینیگال سے آیا ہوں۔

آخر کار گاڑی ہلٹن ہوٹل کے سامنے رکی۔ رسپشن نے ضروری کارروائی کی۔ انھوں نے ہی ایئر انڈیا کی طرف سے ٹیکسی کا کرایہ ادا کیا۔ اس کے بعد ہوٹل کے ایک آدمی نے مجھے کمرہ نمبر ۲۲۷ میں پہنچا دیا۔ رات کے کھانے کے لئے یہاں کے مطعم میں گیا۔ طرح طرح کے کھانے تھے مگر سب فرانسیسی انداز کے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کھاؤں۔ مشکل سے تھوڑا سا کھایا اور کمرہ میں واپس آگیا۔

۱۱ فروری کو عشاء کی نماز ہلٹن ہوٹل کے کمرہ میں پڑھی۔ ہوٹل کا میگزین ہلٹن گیسٹ دیکھتے ہوئے اس کے ایک صفحہ پر نظر پڑی۔ اس میں عالمی بینکنگ کے ایک ادارہ کا اشتہار تھا۔ پہاڑی کے پس منظر میں بنی ہوئی ایک وسیع بلڈنگ کی تصویر تھی۔ بتایا گیا تھا کہ ہمارے دفاتر ہر جگہ اور ہر شہر میں موجود ہیں۔ اس کے نیچے جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا ـــــ آپ جہاں بھی ہوں آپ ہم سے زیادہ دور نہیں ہیں:

Wherever you are, you are never far from Credit Suisse.

میں نے سوچا کہ یہ الفاظ زیادہ صحیح طور پر آخرت کے معاملہ پر چسپاں ہوتے ہیں۔ انسان جہاں بھی ہو، وہ ہر لمحہ آخرت کی دنیا میں کھڑا ہوا ہے۔ کسی بھی لمحہ دروازہ کھلے گا اور وہ اچانک اس کے اندر داخل ہو جائے گا۔

فرانس اور انگلینڈ کے درمیان انگلش چینل حائل ہے۔ دونوں کو ملانے کے لئے اس سمندری حصہ کے نیچے لمبی سرنگ (tunnel) بنائی جارہی ہے۔ ابتداءً اس کا کام ۱۸۸۰ میں شروع ہوا۔ مگر اس کے بعد یہ کام رک گیا۔ دوبارہ یہ کام ۱۹۸۵ میں شروع ہوا۔ یہ کام انگلینڈ اور فرانس کی حکومتوں کے تعاون سے انجام دیا جارہا ہے۔ اس کا نام یورپی سرنگ (Eurotunnel) ہے۔ اندازہ ہے کہ اس کی تکمیل میں ۵۵ سال لگ جائیں گے۔ اس کے بعد ایک کار صرف ۳۵ منٹ میں فرانس سے انگلینڈ پہنچ جائے گی جبکہ سمندری کشتیوں کے ذریعہ ادھر سے ادھر پہنچنے میں تقریباً ۱۵۰ منٹ لگتے ہیں۔ زیر تعمیر سرنگ تقریباً دو ہزار میٹر لمبی ہوگی۔ وہ جدید ترین ٹکنیک کے ذریعہ تیار کی جارہی ہے۔

مغربی ملکوں میں مسلسل نئی ریسرچ ہوتی رہتی ہے۔ جاپان میں یہ مشینی طریقہ رائج ہو چکا ہے کہ ایک آدمی اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو استعمال کئے بغیر آواز کو پہچاننے والے مخصوص کمپیوٹر (voice-recognising computer) کے سامنے اپنا خط ڈکٹیٹ کرتا ہے اور وہ اپنے آپ اس کو ٹائپ کرتا چلا جاتا ہے۔ اب ایسے ٹیلیفون بنانے کی کوشش کی جارہی ہے جس میں ریسیور کو ہاتھ میں

لے کر اس کے سامنے بولنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ آپ بس اپنے ٹیلی فون سے بول کر کہیں گے کہ مجھے فلاں سے بات کرنا ہے۔ وہ اپنے آپ اس کا نمبر معلوم کرکے اس کو ڈائل کرے گا اور پھر صرف بول کر آپ کی اس سے گفتگو شروع ہو جائے گی۔ گویا کار چلاتے ہوئے آپ کو اس کی ضرورت نہ ہوگی کہ آپ وھیل سے اپنا ہاتھ ہٹا کر اپنا موبائل ٹیلیفون ڈائل کریں۔

کویت کے عربی ماہنامہ الوعی الاسلامی (رمضان ۱۴۱۴ھ، فروری ۱۹۹۴ء) میں ایک عربی مقیم پیرس کا مضمون (رمضان فی فرنسا) چھپا تھا۔ اس میں وہ بتاتے ہیں کہ فرانس کے مسلمان طرح طرح کے باہمی اختلافات میں مبتلا ہیں۔ مثلاً فرانس میں دو بڑی مسلم تنظیمیں ہیں، اتحاد المنظمات الاسلامیہ اور المعہد الاسلامی لمسجد باریس۔ رویت ہلال کے بارہ میں دونوں کے اعلانات اکثر مختلف ہوتے ہیں۔ چنانچہ بعض اوقات یہ منظر دکھائی دیتا ہے کہ ایک ہی مسجد میں کچھ لوگ روزہ دار ہیں اور کچھ لوگ بے روزہ (وترى احياناً في المسجد الواحد قوماً صائمين وآخرين مفطرين) اس صورت حال نے اغیار کی نظر میں اسلام کو مذاق بنا دیا ہے۔

فرانس میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً پانچ ملین ہے۔ ان مسلمانوں کے کرنے کا اصل کام یہ تھا کہ وہ دین رحمت کے داعی بنتے مگر نام نہاد انقلابی لیڈر انھیں اسلامی جہاد کے نام پر تشدد کے راستہ پر ڈالنا چاہتے ہیں۔ مکہ کے ہفت روزہ اخبار العالم الاسلامی (۲۴ جنوری ۱۹۹۴) کے انگریزی صفحہ پر ایک رپورٹ فرانس کے بارہ میں ہے، اس میں یہ الفاظ درج ہیں:

> Some fanatic and fundamentalist Muslims are harming Islam more than the Christians.

پچھلے دنوں یہ خبر تمام دنیا کے مسلم اخباروں میں چھپی تھی کہ فرانس کے ایک شہر (Namuta) کے اسکول (Xavier Bichat High School) میں مراکو کی دو لڑکیوں فوزیہ (۱۱ سال)، فاطمہ (۱۳ سال) کو نکال دیا گیا۔ ان لڑکیوں کو اسکول کی طرف سے ستمبر ۱۹۹۳ میں یہ نوٹس دی گئی تھی کہ وہ سر پر اسکارف باندھ کر اسکول نہ آئیں۔ مگر ان لڑکیوں نے اپنے باپ کی ہدایت پر اس سے انکار کر دیا۔ یہ معاملہ چلتا رہا۔ یہاں تک کہ ۵ نومبر ۱۹۹۳ کو ان لڑکیوں کو اسکول سے خارج کر دیا گیا۔

جس طرح اسکارف کے معاملہ میں مسلمانوں کا نقطۂ نظر مغرب کے خلاف ہے، اسی طرح ٹی وی

کے معاملہ میں مسلمانوں کا نقطہ نظر شدید طور پر مغربی تہذیب کے خلاف ہے۔ میں نے یورپ اور امریکہ کے سفروں میں دیکھا کہ اکثر مسلمان باپ ٹی وی کو اپنے بچوں کے لئے سخت مضر سمجھتے ہیں۔ ایک باپ نے کہا کہ ٹی وی ہمارے بچوں کے لئے ایک شیطانی معلم ہے۔ اس کے باوجود تمام مسلمان باپ اپنے گھروں کو خوبصورت ٹی وی سٹ سے سجائے ہوئے ہیں۔

اس فرق کا سبب کیا ہے۔ کیوں وہ اسکارف کے معاملہ میں شدید ہیں اور ٹی وی کے معاملہ میں شدید نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی غیر مسلم اسکول میں جب ایک مسلمان لڑکی کو اسکارف پہننے سے روکا جائے تو یہ مسلمانوں کے لئے اہانت کا کیس بن جاتا ہے۔ اور خود مسلمان اپنے گھروں میں اسکارف کی مخالف تہذیب کا نمائندہ (ٹی وی) کو لاکر رکھیں، یا خود اپنی لڑکیوں کو اسکارف کے بغیر بازار میں گھومنے کی اجازت دیں تو وہ اہانت کا معاملہ نہیں بنتا۔

یہی صورت ہندستان میں بابری مسجد کے معاملے میں پیش آئی۔ اکثر مسلم ملکوں میں سیکڑوں کی تعداد میں مسجدیں ڈھائی گئی ہیں اور مسجد کی جگہ سڑک یا اور کوئی چیز بنا دی گئی ہے۔ مگر ان کے اوپر نہ ہمارے علماء نے کوئی بیان دیا۔ نہ انھوں نے ان مسلم ملکوں کا بائیکاٹ کیا اور نہ ان واقعات پر کوئی ایجی ٹیشن چلایا گیا۔ مگر بابری مسجد کا مسئلہ چوں کہ غیروں نے پیدا کیا اس لئے وہ مسلمانوں کے لئے اہانت کا کیس بن گیا اور تمام مسلمان اس پر بھڑک اٹھے۔

قومی اہانت کے واقعہ پر بھڑکنا اور اسلام کے تقاضوں کے مجروح ہونے پر نہ بھڑکنا، یہ خدا پرستی نہیں ہے بلکہ قوم پرستی ہے۔ اور قوم پرستی کا مذہب خدا کے یہاں مقبول نہیں خواہ اس کے اوپر اسلام کا لیبل لگا دیا گیا ہو۔

علمی اعتبار سے آج فرانس اور مسلم دنیا میں کوئی نسبت نہیں۔ آج دنیا بھر کے مسلمان فرانس صرف اس لئے جاتے ہیں کہ وہاں کمائیں یا اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ مگر آٹھ سو سال پہلے صورت حال اس سے بالکل مختلف تھی۔

اسٹین لی لین پول (Lane-Poole) نے اس زمانہ کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فرانس، جرمنی، انگلینڈ اور یورپ کے ہر حصہ سے طلبہ اسپین جاتے تھے تاکہ علم کے اس سرچشمہ سے سیراب ہو سکیں جو اس وقت صرف مسلم شہروں میں بہہ رہا تھا:

Students flocked from France, Germany, England and every part of Europe to drink from the fountain of learning which flowed only in the city of Moors. (The Moors in Spain)

فرانس کے شہر نموتہ (Namuta) میں ایک اسکول ہے جس کا نام ہے زیویر بشات اسکول (Xavier Bichat High School) یہاں ۵ انومبر ۱۹۹۳ کو یہ واقعہ ہوا کہ مراکو کی دو لڑکیاں فوزیہ (۱۱ سال) اور فاطمہ (۱۳ سال) اسکول سے خارج کر دی گئیں۔ وہ سر پر اسکارف باندھ کر آتی تھیں۔ اسکول کے ذمہ داروں نے انھیں منع کیا، کیوں کہ یہ ان کے اسکول کے آداب کے خلاف تھا۔ لڑکیوں نے اپنے باپ میمون عقیل کی ہدایت پر یہ حکم ماننے سے انکار کیا۔ اس کے بعد انھیں اسکول سے خارج کر دیا گیا۔

تمام دنیا کے مسلم اخباروں میں اس پر احتجاجی رپورٹیں شائع ہوئیں۔ اس کو یورپ کی اسلام دشمنی پر محمول کیا گیا۔ کہا گیا کہ یورپ مسلمانوں سے صلیبی جنگوں کا بدلہ لینا چاہتا ہے اور اسکارف کی مخالفت اس انتقامی عمل کا آغاز ہے۔ رباط کے ایک عربی ہفت روزہ الرایۃ (۴ رمضان ۱۴۱۴ھ، ۱۵ فروری ۱۹۹۴ء) میں میں نے استاذ ابراہیم الغشبانی کا ایک مضمون اس کی بابت پڑھا اس کا عنوان تھا: اوربا تخوض حربا ضد وجود الاسلام۔ یعنی یورپ نے اسلام کے وجود کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ لڑکیوں کے والد میمون عقیل نے کہا کہ ہم اسلامی لباس کیوں کر چھوڑ سکتے ہیں۔ حالاں کہ یہ بہت بڑا گناہ ہے اور جو اس پر عمل نہیں کرے گا خدا اس کو سخت عذاب دے گا۔

(العالم الاسلامی، مکہ، ۱۵ جنوری ۱۹۹۴)

ایک طرف فرانس بلکہ سارے یورپ کے خلاف یہ غوغا ہے۔ دوسری طرف مراکو میں دو ہفتہ تک رہا۔ وہاں میں نے اسکول اور کالج اور یونیورسٹی کے طلبہ اور طالبات کو دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ ہر جگہ مراکشی لڑکیاں عام طور پر کھلے سر کے ساتھ گھوم رہی ہیں۔ فرانس میں لڑکیوں کا سر کھلا ہونا اسلام کے لئے خطرہ تھا مگر اپنے وطن میں سر کھولنے کے باوجود اسلام پوری طرح محفوظ تھا۔

فرانس کا اقتدار ایک عرصہ تک افریقہ میں رہا ہے۔ مثلاً مالی میں ۷۵ سال تک فرانس کا اقتدار قائم تھا۔ سعودی عرب میں مالی کے سفیر دکتور محمود الزبیر کا ایک انٹرویو ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۹ شعبان ۱۴۱۴ھ) میں چھپا ہے۔ انٹرویو رنے پوچھا کہ مالی لمبی مدت تک فرانسیسی

استعمار کے تحت رہا ہے، اس کے اثرات ملک کے عوام پر کیسے تھے۔ سفیر مذکور نے جواب دیا کہ فرانس نے مالی کے مسلمانوں کی دینی شخصیت کو مسخ کرنے کی پوری کوشش کی۔ اس کے لئے انھوں نے اسلامی مدارس کو ختم کر کے فرانسیسی اسکول قائم کئے۔ اس کی وجہ سے مالی کی نسل تعلیم سے محروم ہو گئی۔ کیوں کہ لوگوں نے اپنے بچوں کو ان اسکولوں میں نہیں بھیجا:

فقضوا على التعليم الاسلامي وفتحوا بدلا من المدارس الاسلامية مدارس فرنسية وهٰذا ما جعل السكان يبقون أولادهم بدون تعليم على أن يلحقوهم بتلك المدارس۔

یہی واقعہ خود ہندستان میں بھی پیش آیا۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی صحیح پالیسی نہیں۔ تعلیم کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ ایک دن کے لئے بھی اس کو روکا نہیں جا سکتا۔ ایسے حالات میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ زمانی تعلیم کے لئے طلبہ کو اسکولوں اور کالجوں میں بھیجا جائے۔ مگر اسی کے ساتھ گھر پر یا شبینہ مدارس کی صورت میں دینی تعلیم کا طاقت ور انتظام کیا جائے۔ ایسے حالات میں مسلمان کے لئے علیحدگی نہیں ہے بلکہ مقابلہ ہے۔ بدقسمتی سے اکثر لوگ مقابلہ کے نام سے صرف مسلح ٹکراؤ کو جانتے ہیں وہ تدبیری جدوجہد کی اہمیت سے واقف نہیں۔

فرانس سے نپولین بوناپارٹ کا نام وابستہ ہے۔ وہ ۱۷۶۹ میں کورسیکا میں پیدا ہوا، اور ۱۸۲۱ میں جزیرہ سینٹ ہیلینا میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ مغرب کی تاریخ میں چند انتہائی نمایاں شخصیتوں میں سے ایک ہے۔ اس نے فرانس کا اقتدار یورپ کے بڑے حصہ پر قائم کر دیا تھا۔ تاہم اس کا آخری انجام یہ ہوا کہ اس کے حریف انگریز نے اس پر قابو پا کر اس کو جنوبی اٹلانٹک کے ایک جزیرہ میں نظر بند کر دیا۔ اور وہیں اس کا انتقال ہو گیا۔

ایک شخص جس نے ۲۰ سال تک واقعات سے بھری ہوئی زندگی گزاری۔ جو اپنی طاقتور فوج کے ساتھ زمین کے پورب اور پچھم، اتر اور دکھن مارچ کرتا رہا۔ وہ آخر کار ایک چھوٹے سے جزیرہ میں تنہائی کی حالت میں مر گیا۔ جزیرہ کی قید کے زمانہ میں اس کو ایک برطانی افسر کے ہمراہ پورے جزیرہ میں چلنے پھرنے کی اجازت تھی۔ مگر ہمراہی کی شرط کو اس نے قبول نہیں کیا۔ چنانچہ زیادہ تر وقت وہ اپنے گھر پر گزارتا رہا۔

قید کے زمانہ میں اس نے انگریزی سیکھنا شروع کیا۔ اس نے اتنی انگریزی سیکھ لی کہ وہ

انگریزی کا اخبار پڑھنے لگا۔ ۵ مئی ۱۸۲۱ کو اس کی حالت زیادہ خراب ہوئی۔ آخر وقت میں وہ کوئی مربوط کلام بولنے کے قابل نہ تھا۔ اس کی زبان سے حسب ذیل الفاظ غیر مربوط طور پر سنے گئے ــــ میرے خدا ... فرانسیسی قوم ... میرا بیٹا ... فوج کا سردار :

My God... The French nation.. my son... head of the army.

شام کو اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کی عمر بمشکل ۵۲ سال تھی۔ اس کے جنازہ میں صرف چند آدمی تھے۔ سینٹ ہیلینا کے ایک گوشہ میں اس کو دفن کر دیا گیا۔ اس کی قبر پر جو کتبہ لگایا گیا، اس پر اس کے نام کے بغیر صرف یہ دو لفظ لکھے ہوئے ہیں: یہاں مدفون ہے (Here lies)

موت کا قانون اسی طرح ہر آدمی کی نفی کر رہا ہے۔ وہ ہر نامور کو بے نام بنا رہا ہے۔ وہ ہر جتھے والے کو بے جتھا کر رہا ہے اور ہر ملک والے کو بے ملک۔ یہ بلاشبہ سب سے بڑا اعلان ہے جو ہزاروں سال سے اس زمین پر کیا جا رہا ہے۔ مگر کوئی نہیں جو اس کو سنے۔ کوئی نہیں جو اپنے مستقبل کو اپنے حال میں دیکھ لے۔

۱۲ فروری کی رات ہوٹل کے کمرہ میں گزری۔ سو کر اٹھا تو حوائج سے فارغ ہو کر وضو کیا۔ پھر دو رکعت نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہوا تو بے اختیار یہ الفاظ زبان پر آگئے : خدایا، دو رکعت نماز قبول فرمائیے فرانس کی سرزمین پر جہاں بارہ سو سال پہلے اسلام کی بڑھتی ہوئی پیش قدمی روک دی گئی۔

ہوٹل کی طرف سے ہر پندرہ منٹ پر ایک کوچ ایئر پورٹ کی طرف جاتی ہے۔ اس سے روانہ ہو کر اورلی ایئر پورٹ پہنچا۔ یہاں سے ایئر فرانس کی فلائٹ ۸۷۸۸ کے ذریعہ کیسابلانکا کے لئے روانگی ہوئی۔ راستہ میں فلائٹ میگزین ایئر فرانس دیکھا۔ یہ فرانسیسی اور انگریزی دو زبانوں میں تھا۔ ایک مضمون یورپ کے بارہ میں تھا۔ اس میں آغاز کے وقت سے بتایا گیا تھا کہ جب زمین خشکی اور تری میں تقسیم ہوئی، اس وقت یورپ کا جغرافی نقشہ کیا تھا۔ پھر تفصیل سے بتایا گیا تھا کہ نیچر نے یہاں کیا کیا وسائل جمع کئے۔ ان وسائل کی فہرست دیتے ہوئے آخر میں کہا گیا تھا کہ ان کے علاوہ ایک اور چیز بھی جس کو الفاظ میں بتایا نہیں جا سکتا :

...and another substance that language cannot describe.

اس کو پڑھ کر میں نے سوچا کہ یہی معاملہ ہر چیز کا ہے، حتی کہ گھاس اور مکھی جیسی چیزوں کا بھی۔ ہر چیز بے شمار عناصر کا مجموعہ ہے۔ اس میں سے کچھ کو ہم اپنی زبان میں کسی حد تک بتاتے ہیں۔ مگر اس کے علاوہ ہر چیز میں کچھ اور عناصر ہیں جن کو انسانی زبان میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبون (۱۲-۱۳ فروری ۱۹۹۴) کا پیرس اڈیشن دیکھا۔ امریکہ نے اقوام متحدہ کے فیصلہ کے تحت بوسنیا کی جنگ کو روکنے کے لئے فوجی اقدام کیا ہے۔ آج کے اخبار میں کئی خبریں اور تصویریں اس کے بارہ میں تھیں۔ ایک رپورٹ میں اس علاقہ کے لوگوں کے تاثرات نقل کئے گئے تھے۔ بوسنیا کے ایک ۵۸ سالہ مسلمان (Ferid Hodzic) نے کہا کہ پچھلے دو دن سے میں محسوس کر رہا ہوں جیسے کہ جنگ ختم ہو گئی اور سراجیوو میں امن واپس آرہا ہے:

The last two days, I have been feeling like the war is over and peace is returning to Sarajevo.

خدا کرے کہ بوسنیا ہرزے گووینا میں جنگ کی تباہ کاری ختم ہو جائے اور وہاں دوبارہ امن کا دور آجائے۔

پیرس سے کیسابلانکا جاتے ہوئے میری سیٹ کے قریب ایک تندرست فرانسیسی بچہ تھا۔ اس کو دیکھ کر میں نے کہا کہ ایسا انسان بھلا ارتقا کے بے شعور طبیعی قانون کے ذریعہ کیسے بن سکتا ہے۔ ارتقا، تو ایک مفروضہ اندھا قانون ہے۔ مگر انسان ایک زندہ اور ذہین وجود ہے۔ سارے انسان مل کر بھی گھاس کی ایک پتی کی تخلیق نہیں کر سکتے۔ پھر اگر ایک معلوم وجود تخلیق کی قدرت نہیں رکھتا تو ایک نامعلوم وجود اتنے عظیم اور اتنے بامعنی عالم کو کس طرح پیدا کر سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ارتقا کا نظریہ بے معنی الفاظ کے مجموعہ کے سوا اور کچھ نہیں۔

پیرس سے کیسابلانکا کا سفر ڈھائی گھنٹہ کا تھا۔ اس دوران جہاز نے ۲۹ ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کیا۔ میں کل ایشیا سے روانہ ہوا تھا۔ پھر میں یورپ پہنچا۔ اور اب میں افریقہ کی زمین پر پہنچ کر یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ مجموعی مدت پرواز کے لحاظ سے اس سفر میں ساڑھے بارہ گھنٹے صرف ہوئے۔

کیسابلانکا میں وزارۃ الاوقاف والشئون الاسلامیہ کے نمائندہ کے طور پر ایک صاحب موجود تھے۔ ایرپورٹ سے ان کے ساتھ رباط کے لئے روانہ ہوا۔ تقریباً ایک سو کلو میٹر کا راستہ شروع سے

لے کر آخر تک نہایت شاندار ہے۔ عمدہ سڑک کے دونوں طرف سرسبز ماحول دور تک پھیلا ہوا تھا۔

مراکو کے اوپر سے سیاسی اقتدار اگرچہ ختم ہوگیا۔ مگر فرانس کا اقتصادی غلبہ مراکو کے اوپر بدستور باقی ہے۔ اس کا اندازہ مجھے مراکو میں داخل ہونے سے پہلے اس وقت ہوا جب کہ جہاز کے اندر ایمبارکیشن/ڈس ایمبارکیشن فارم پر کرنے کے لئے دیا گیا۔ اس فارم کے نیچے لکھا ہوا تھا کہ فرانس میں چھپا ہوا (Printed in France) قدیم زمانہ میں کسی ملک سے سیاسی اقتدار ختم ہونے کے بعد ناممکن ہو جاتا تھا کہ اس کو دوسرے قائم رکھا جا سکے۔ مگر آج صنعتی ترقی کے بعد ایسا کرنا عین ممکن ہو گیا ہے۔

رباط میں میرا قیام ہوٹل (Hyatt Regency) کے کمرہ نمبر ۳۰۷ میں تھا۔ یہاں میں نے ۱۲ فروری کو رمضان ۱۴۱۴ھ کا پہلا روزہ رکھا۔ ایک عرب نوجوان سے گفت گو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ روزہ کا مقصد انسان کو یہ بتانا ہے کہ دنیا میں جو چیزیں ہیں ان سب کا مالک خدا ہے، انسان کسی بھی چیز کا مالک نہیں۔ خدا نے اپنی اس حیثیت کو بتانے کے لئے کھانے پینے کو بطور علامت اختیار کیا۔ روزہ کا مقصد آدمی کے اندر یہ نفسیات پیدا کرنا ہے کہ خدایا، تو ہی ہر چیز کا مالک ہے۔ جب تو نے روکا تو میں رک گیا، اور جب تو نے اجازت دی تو میں نے ان کو استعمال کیا۔

کیسا بلانکا (عربی: الدار البیضاء) مراکو کا قدیم شہر ہے۔ اس کا یہ نام پرتگالیوں اور اسپینیوں نے رکھا تھا۔ بارھویں صدی عیسوی میں وہ صرف ایک گاؤں تھا۔ آج وہ قاہرہ، اسکندریہ، بغداد کے بعد عرب دنیا کا چوتھا سب سے بڑا شہر ہے۔ ۱۹۱۲ سے ۱۹۵۶ تک وہ فرانس کی ماتحتی میں رہا۔ فرانسیسی زبان اور فرانسیسی تہذیب کی چھاپ یہاں بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔

رباط اٹلانٹک کے کنارے ایک قدیم شہر ہے۔ وہ مراکو کی راجدھانی ہے۔ اسپین سے جب مسلمان نکالے گئے تو ان کی بڑی تعداد اسی علاقہ میں آکر آباد ہوئی۔ ۱۹۵۶ میں وہ فرانس کے سیاسی قبضہ سے آزاد ہوا۔ ۱۹۱۲ میں جب مراکو پر فرانس کا سیاسی قبضہ ہوا تو مولانا شبلی نعمانی نے ایک نظم میں کہا تھا:

مراکش جا چکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کب تک

مسلم ملکوں پر مغرب کے استعمار کو مسلم رہنماؤں نے صرف اس کے تاریک رخ سے دیکھا۔ حالاں کہ اس میں ایک روشن پہلو بھی موجود تھا۔ اسی کے نتیجہ میں لاکھوں مسلمان مسلم ملکوں سے نکل کر مغربی ملکوں میں

آباد ہو گئے۔ آج یورپ میں مسلمانوں کی جو تعداد پائی جاتی ہے اور وہاں اسلام کو زندہ کئے ہوئے ہے وہ زیادہ تر وہی ہے جو نوآبادیاتی دور میں وہاں جاکر آباد ہوئی تھی۔

۱۳ فروری کو ہوٹل سے نکلا کہ کسی مسجد میں ظہر کی نماز ادا کروں۔ ڈرائیور السید محمد البدوانی جو ایک گاڑی کے ساتھ مستقل میرے لئے مخصوص کئے گئے تھے، انھوں نے بہت چاہا کہ میں گاڑی پر چلوں۔ مگر میں نے عذر کر دیا اور ایک عرب نوجوان کے ساتھ پیدل چل کر مسجد حنصالی (جامع الحنصالی) پہنچا۔ وہاں جماعت تیار تھی۔ مجھے مسجد کا ماحول طبعی طور پر بہت پسند ہے۔ چنانچہ نماز سے فراغت کے بعد میں مسجد میں بیٹھ گیا۔ میں خاموش دیر تک بیٹھا رہا، یہاں تک کہ تمام نمازی مسجد سے چلے گئے۔ آخر میں مسجد کے موذن صاحب میرے پاس آئے اور کہا: نريد ان نسدّ ابواب المسجد، بارك الله فيكم (ہم مسجد کے دروازے بند کرنا چاہتے ہیں، اللہ آپ پر برکت نازل فرمائے) چنانچہ میں فوراً اٹھ کر مسجد کے باہر آگیا۔

یہی اکثر عرب ملکوں کا حال ہے۔ وہاں نماز کے بعد مسجد کے دروازہ پر تالا لگا دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اگلی نماز کے وقت یہ تالا کھلتا ہے۔ صرف اس لئے کہ دوبارہ نماز کے بعد اسے بند کر دیا جائے۔ ان ملکوں میں ایسا حکومت کے احکام کے تحت کیا جاتا ہے۔ اگر ہندستان کی حکومت یہاں کی مسجدوں کے بارہ میں ایسا حکم جاری کر دے تو فوراً اس کو مداخلت فی الدین قرار دیکر اس کے خلاف احتجاجی مہم شروع کر دی جائیگی۔ ممکن ہے کہ کچھ مقدس لوگ اپنے حجروں سے نکل کر اس کے خلاف دھرنا دینے کے لئے دہلی پہنچ جائیں۔ مگر یہی مقدس حضرات عرب ملکوں میں نہایت اطمینان کے ساتھ اس کو برداشت کئے ہوئے ہیں۔ ہمارے نااہل رہنماؤں کی یہی دو عملی موجودہ مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

مسجد کے راستہ میں مغرب کے ایک مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنا نام عبدالمجید الکامل بتایا۔ ان سے میں نے کہا کہ میں یہاں دروس حسنیہ میں شرکت کے لئے آیا ہوں۔ انھوں نے کہا: المكتبة الاسلامية مليئة بالكتب ولكن الاعمال مفقودة. نقرء ولا نعمل، نخطط ولا نطبق (اسلامی کتب خانہ کتابوں سے بھرا ہوا ہے۔ مگر اعمال غائب ہیں۔ ہم پڑھتے ہیں مگر ہم عمل نہیں کرتے، ہم نقشہ بناتے ہیں مگر ان کو نافذ نہیں کرتے)

اکثر کہا جاتا ہے کہ یہ کہنے والے صرف کہتے ہیں اس لئے سننے والے لوگ بھی صرف سن کر رہ جاتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ خدا کے پیغمبروں نے تو کامل اخلاص کے ساتھ دعوت دی۔ اس کے باوجود ان کے معاصرین ان کی بات ماننے پر راضی نہیں ہوئے۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ صورت داعی کے غیر مخلص ہونے کی بنا پر نہیں ہے بلکہ مخاطبین کی عدم قبولیت کی بنا پر ہے۔ موجودہ زمانہ میں مادی چیزوں کی طرف رغبت اتنی زیادہ بڑھ چکی ہے کہ لوگوں کو مادی چیزوں کے سوا کسی اور چیز سے کوئی دلچسپی نہیں۔

مسجد سے واپس ہوکر ہوٹل پہنچا تو یہاں دکتور محمد الکبیر علوی میرا انتظار کر رہے تھے۔ وہ وزارۃ الاوقاف والشئون الاسلامیۃ میں مدیر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ بہت عرصہ ہوا میں نے آپ کی کتاب الاسلام یتحدی پڑھی تھی۔ اس کے بعد کوئی اور کتاب مجھ کو نہیں ملی۔ وہ میرے ساتھ میرے کمرہ میں آئے تو یہاں میں نے ان کو الاسلام یتحدی سمیت کئی اور عربی کتابیں دیں۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے تجویز کیا کہ ان کتابوں کا ایک سٹ جلالۃ الملک اور وزیر اوقاف کو ضرور دیں۔ وہ بہت خوش ہوں گے۔

ایک بار میں رباط جدید کے علاقہ میں نکلا۔ یہاں مکانوں کے سامنے نارنگی (برتقال) کے بڑے بڑے درخت تھے، وہ لال رنگ کی نارنگیوں سے لدے ہوئے تھے۔ میرے ایک عرب ساتھی نے بتایا کہ یہ لوگ ان درختوں کو اپنے گھر کے سامنے صرف خوبصورتی کے لئے لگاتے ہیں، وہ ان کے پھلوں کو استعمال نہیں کرتے، نہ کوئی اور ان کو توڑتا۔

یہ میرے لئے بڑے تعجب کی بات تھی۔ دہلی میں اگر کوئی اپنے گھر کے سامنے اس طرح پھل دار درخت لگائے تو ایک بھی پھل درخت پر باقی نہیں رہے گا، خواہ وہ نئی دہلی میں ہو یا پرانی دہلی میں۔

مراکش (مراکو) ایک سیاحتی ملک ہے۔ اس بنا پر یہاں مغربی آزادی کے آثار کافی دکھائی دیتے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ یہاں کے لوگوں میں دینی تعلق بھی بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک مراکشی عالم کا قصہ قابل ذکر ہے جو اس طرح بیان کیا جاتا ہے:

جدہ میں شیخ محمد نصیف کے گھر پر ایک مراکشی عالم ایک بے داڑھی والے مصری سے الجھ گئے۔ مصری عالم سے انھوں نے پوچھا کہ آپ کہاں سے ہیں۔ مصری عالم نے جواب دیا: من احسن

دولۃ فی العالم (دنیا کے سب سے اچھے ملک سے) مراکشی عالم نے دوبارہ پوچھا کہ سعودیہ کے کس شہر سے۔ مصری عالم نے جواب دیا: من احسن دولۃ فی العالم وھی مصر ومن احسن مدینۃ فی العالم وھی القاھرۃ (دنیا کے سب سے اچھے ملک مصر سے اور دنیا کے سب سے اچھے شہر قاہرہ سے) مراکشی عالم اس جواب پر غصہ ہوگئے اور کہا کہ تمہارے ملک کے بارہ میں اللہ نے فرمایا ہے سأوریکم دار الفاسقین۔ میں بہت جلد تم کو فاسقوں کا گھر دکھاؤں گا، یعنی مصر۔ مصری عالم غصہ میں آکر کھڑے ہوگئے اور مراکشی عالم کی داڑھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے حمار کہہ کر چپ ہوگئے۔ (البلاغ بمبئی، جنوری ۱۹۹۴ صفحہ ۲۵)

اس واقعہ میں مصری عالم کی غلطی اگر بے جا فخر ہے تو مراکشی عالم کی غلطی یہ ہے کہ ایک واقعہ جو اعراض کے حکم کے تحت آتا تھا اس کو انھوں نے نہی عن المنکر کے حکم سے متعلق سمجھ لیا۔

۱۳ فروری کو مصر وغیرہ کے کچھ نوجوان یہاں میری آمد کی خبر سن کر آگئے۔ آج کا بیشتر وقت ان سے گفتگو میں گزرا۔ مختلف مقامات پر آجکل کچھ مسلم جماعتیں "مسلح انقلاب" کی کوشش کر رہی ہیں۔ وہ قائم شدہ حکومتوں سے مسلح ٹکراؤ چھیڑے ہوئے ہیں۔ ان کے بارہ میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ یہ سب اسلام کے نام پر غیر اسلام ہے۔ کیوں کہ اسلام میں قائم شدہ حکومت کے خلاف خروج کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ (شرح نووی ۱۲/۲۲۹)

اس کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ کسی قائم شدہ حکومتی نظام کو توڑنا محض کسی شخص یا گروہ کی کوشش سے نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ہمیشہ تاریخ کی مساعدت درکار ہوتی ہے۔ اگر تاریخی تبدیلیاں مساعدت کے لئے موجود نہ ہوں تو ایسی ہر تحریک فساد اور خوں ریزی پر منتج ہوتی ہے اہل اسلام کو چاہئے کہ وہ اپنے عمل کو صرف پرامن دعوتی جدوجہد تک محدود رکھیں۔ یہاں تک کہ وہ ضروری تاریخی امکانات پیدا ہو جائیں جن کو استعمال کرکے سیاسی انقلاب کے مرحلہ تک پہنچنا ممکن ہو جائے۔

رباط پہنچنے کے بعد کل شام کو میں نے اپنے دہلی کے دفتر کو ایک فیکس روانہ کیا تھا۔ آج وہاں سے اس کا جواب آگیا۔ اس کو دیکھ کر میری زبان سے شکر کا کلمہ نکلا۔ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو کیسے کیسے وسائل دے دئے ہیں۔ یہ سن کر ایک عرب نوجوان نے

کہاکہ آپ ان چیزوں پر شکر ادا کر رہے ہیں، حالاں کہ میں نے ایک بڑے شیخ کو ان ذرائع کی مذمت کرتے ہوئے سنا۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں ان ذرائع مواصلات کے ذریعہ شیطانی باتیں ہر جگہ تیزی سے پہنچائی جا رہی ہیں۔ یہ جدید آلات سب شیطان کے کام ہیں اور ہمیں ان سے جنگ کرنا چاہئے:

الکلمات الشیطانیۃ فی ہٰذہ الایام تُرسَل عن طریق الاتصالات الحدیثۃ (ومنہا الفاکس) الیٰ کل مکان بسرعۃ ۔ فہٰذہ الاجہزۃ المنظورۃ کلہا عمل شیطانی یجب علینا محاربتہا۔

میں نے کہا کہ شیخ نے بڑی عجیب بات کہی۔ یہ جدید ذرائع تو امکانات فطرت کا استعمال ہیں۔ جو چیز بری ہے وہ استعمال ہے نہ کہ خود ذرائع۔ اور برا استعمال تو لوگ مذہب تک کا کرتے ہیں۔ اس لئے ہمیں برے استعمال کی مذمت کرنا چاہئے نہ کہ خود ان اشیا کی۔

رباط میں لیبیا کے ایک صاحب (شیخ صالح) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ لیبیا میں ۱۹۶۷ میں جب انقلاب آیا تو اس کے لیڈر سوشلسٹ افکار سے متاثر تھے۔ انھوں نے ملک میں جو تبدیلیاں کیں ان میں سے ایک یہ تھا کہ انھوں نے اعلان کیا کہ گھر اس کا ہے جو گھر میں رہے۔ ہر طرف دیواروں پر لکھ دیا گیا: البیت لساکنہ۔ مگر لیبیا میں بہت ہی کم ایسے افراد تھے جنھوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ بیشتر لوگوں نے اس قانون کو استعمال کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ کرایہ دار بدستور کرایہ دیتے رہے۔ مکانوں کی خرید و فروخت پہلے ہی کی طرح جاری رہی۔

تھوڑے سے افراد جنھوں نے اس حکومتی اعلان کا فائدہ اٹھایا وہ معاشرہ میں سخت معیوب نظروں سے دیکھے جانے لگے۔ ان کو اپنی جائداد کے لئے خریدار یا کرایہ دار ملنا سخت مشکل ہو گیا۔ شیخ صالح نے بتایا کہ میں نے خود اپنے لئے ایک مکان خریدا ہے۔ مجھے مذکورہ قسم کا مغصوبہ مکان کم قیمت پر مل رہا تھا۔ مگر میں نے اس کو نہیں لیا۔ اس کے بجائے جائز ملکیت والا مکان اپنے لئے خریدا۔

یہ نہایت عجیب ہے۔ ہندستان میں ہم نے دیکھا ہے کہ آزادی کے بعد خاتمہ زمینداری کا قانون منظور کیا گیا۔ اور حکومت نے اعلان کیا کہ "جو جوتے اس کا کھیت" اس کا نتیجہ ہوا کہ تمام کسان اپنے زیر

استعمال کھیتوں پر قبضہ کرکے بیٹھ گئے۔ زمینوں کے مالک اچانک بے زمین ہو کر رہ گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ لیبیا کی قوم کو اگر صحیح اور دانش مند قائد ملا ہوتا تو آج وہ مسلم دنیا کی سب سے زیادہ ممتاز قوم ہوتی۔ ان کے پاس ذرائع و وسائل وافر مقدار میں موجود تھے۔ وہ بہترین جائے وقوع کا مالک تھا۔ مگر سوشلسٹ قائدین نے لیبیا کو تباہ کرکے رکھ دیا۔

۱۴ فروری کو میرا دوسرا روزہ تھا۔ سحری کے لئے کل میں نے دودھ اور کھجور لیا تھا۔ آج بھی میں نے صرف دودھ اور کھجور منگوایا۔ اکثر لوگ سحری کے وقت خوب زیادہ کھاتے ہیں۔ مگر یہ طریقہ درست نہیں۔ اس سے روزہ کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ لوگوں کی توجہ صرف اس پر ہوتی ہے کہ دن کے وقت بھوک نہ لگے۔ حالاں کہ روزہ رکھ کر آدمی کو بھوک لگنا چاہئے تاکہ اس پر روحانی تجربات گزریں اور اس کے اندر توجہ الی اللہ کی کیفیت پیدا ہو۔

کل اچھی دھوپ تھی۔ چنانچہ میں ہوٹل سے نکل کر سامنے کے پارک میں دیر تک ٹہلتا رہا۔ آج بادل چھائے ہوئے ہیں اور ہلکی بارش بھی ہوئی ہے۔ اگر میں بادلوں کی جمی ہوئی تہہ کے اوپر چلا جاؤں تو آج بھی سورج بدستور چمک رہا ہوگا۔ مگر بادلوں کے نیچے سورج کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ یہ ایک سادہ سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کا مشاہدہ صرف اضافی ہے، کوئی انسانی مشاہدہ حقیقی مشاہدہ نہیں۔

۱۴ فروری کی دوپہر کو وزارۃ الاوقاف والشئون الاسلامیہ کے وزیر عبد الکبیر العلوی المدغری سے اجتماعی ملاقات ہوئی۔ مختلف ملکوں سے آئے ہوئے علماء ان کے دفتر میں لے جائے گئے جو القصر الملکی کے وسیع احاطہ میں واقع ہے۔ ان کا لباس اور ان کی گفتگو ہر چیز میں تواضع نظر آئی۔ انھوں نے الدروس الحسنیہ الرمضانیہ کے بارہ میں بتایا کہ وہ المغرب میں اور دوسرے عرب ملکوں میں ساتھ ساتھ ٹی وی پر دکھایا جاتا ہے۔ ملک حسن الثانی خود اس میں شروع سے آخر تک موجود رہتے ہیں اور وہ صرف ملک نہیں ہیں بلکہ ایک اچھے عالم بھی ہیں۔

آنے والوں میں سے ایک جرمنی کے نومسلم بھی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ان کا پچھلا نام (Thomas Haacke) تھا۔ ۱۹۷۵ میں انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔ موجودہ نام حسن ہاکے ہے۔ ان کی عمر ۳۱ سال ہے۔ برلن میں مولانا صدر الدین لاہوری نے ۱۹۲۴ میں ایک سہ ماہی جرمن رسالہ نکالا

تھا۔ اس کا نام (Moslemische Revue) ہے۔ اس کا تازہ شمارہ انھوں نے مجھ کو دکھایا۔ وہ اس کے اڈیٹوریل بورڈ میں بھی ہیں۔ جرمنی میں ترکی وغیرہ کے مسلمانوں سے ان کا ملنا جلنا ہوتا تھا۔ اس کے دوران وہ اسلام سے متاثر ہوئے اور اسلام میں داخل ہو گئے۔ وہ ایک کمپیوٹر فیکٹری میں کام کرتے ہیں۔

جب میں نے بتایا کہ میں انڈیا سے آیا ہوں تو انھوں نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ ہندوؤں نے ایک قدیم مسجد کو ڈھا دیا۔ اب وہاں کیا حال ہے۔ انڈیا کے باہر کے لوگ صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ وہاں بابری مسجد ڈھائی گئی ہے۔ اس کے سوا یہاں بے شمار تعمیری واقعات بھی ہیں مگر لوگوں کو اس کی خبر نہیں۔

۵ فروری کو بادل ہٹ گئے اور دوبارہ آسمان صاف ہو گیا۔ یہاں کا موسم اہل یورپ کے لئے بہت پسندیدہ موسم ہے۔ چنانچہ یورپی سیاح کثرت سے مراکو آتے ہیں۔ یہاں کی آمدنی کا قابل لحاظ حصہ سیاحت انڈسٹری کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے آزادی کے بعد بھی یہاں کے کلچر پر یورپی سیاحوں کا بہت زیادہ اثر ہے۔ بلکہ یہاں کے کلچر کو اگر سیاح کلچر کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا۔

ایک 'حادثہ' پیش آیا۔ میں اپنے کمرہ سے باہر نکلا۔ کنجی اندر تھی۔ دروازہ اپنے آپ بند ہو گیا۔ اب میں دروازہ کو کھول نہیں سکتا تھا۔ اس کے بعد میں ریسپشن کے ڈسک پر گیا۔ ان کو اپنے مسئلہ کی بابت بتایا۔ ان کا ایک آدمی فوراً ایک خاص کنجی لے کر آیا۔ یہ ماسٹر کی تھی جس سے ہوٹل کے تمام تالے کھولے جا سکتے ہیں۔ اس نے ماسٹر کی کے ذریعہ فوراً تالا کھول دیا۔ اب میں کمرہ کے اندر تھا۔

میں نے سوچا کہ یہی معاملہ زیادہ بڑے پیمانے پر زندگی کا بھی ہے۔ زندگی میں ایک قسم کی کنجیاں وہ ہیں جن سے صرف ایک مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے۔ ایک کنجی صرف ایک تالے کو کھولتی ہے۔ دوسری کنجی ماسٹر کنجی ہے۔ اس کنجی کے استعمال سے تمام تالے کھولے جا سکتے ہیں۔ یہ ماسٹر کی اہل اسلام کے لئے دعوت ہے۔ اہل اسلام کے لئے بلاشبہ دعوت الی اللہ وہ ماسٹر کی ہے جس کو استعمال کیا جائے تو وہ تنہا تمام بند تالوں کو کھولنے کے لئے کافی ہے۔ تاہم دعوت کی ماسٹر کی کو استعمال کرنے کی لازمی شرط مدعو کی زیادتیوں پر صبر ہے۔ مسلمان اگر صبر کی قیمت ادا نہ کریں تو وہ دعوت کی ماسٹر کی

۱ ہندی اخبار راشٹریہ سہارا کے نمائندے شری ارن پانڈے اور مسٹر دلیپ چوبے نے ۲۱ ستمبر ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس مسئلہ سے تھا کہ مہاتما گاندھی کا عدم تشدد کا فلسفہ کس حد تک جدید حالات سے متعلق ہے۔

۲ جامعہ ملیہ اسلامیہ (انصاری آڈیٹوریم) میں ۲۴ ستمبر ۱۹۹۴ کو میلاد النبی کا جلسہ ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور ایک مفصل تقریر کی۔ اس کا موضوع تھا: آفاقی انسانی قدریں، سیرت کی روشنی میں۔

۳ آل انڈیا ملی کونسل کے زیر اہتمام دہلی میں ۲۳ ۔ ۲۵ ستمبر ۱۹۹۴ کو کل ہند مدارس کنونشن منعقد ہوا۔ اس میں پاس کی جانے والی دس تجاویز میں سے ایک یہ تھی: کل ہند پیمانہ پر منتخب فضلاء مدارس کو دعوت الی اللہ کے کام کے لئے درکار تعلیمی تربیت کے مرحلہ سے گزارنے کے لئے ایک مرکز قائم کیا جائے۔ مدارس کے اساتذہ وطلبہ میں دعوتی جذبہ پیدا کرنے کے لئے خصوصی اجتماعات کئے جائیں۔ خالص دعوتی نقطۂ نظر سے مدرسوں میں علاقائی زبان اور انگریزی کی تعلیم دی جائے۔ طلبہ کو گردوپیش کی بستیوں میں دعوتی کام کے لئے بھیجا جائے۔

۴ مسٹر عبد الرحمٰن عابد (فری لانس جرنلسٹ) نے ۲۶ ستمبر ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر طلاق کے بارہ میں اسلامی قوانین سے تھا۔

۵ بنگلہ دیش سے مولانا محمد شمس الحق نے مطلع کیا ہے کہ انھوں نے اسلامی مرکز کی کتابوں کا ترجمہ بنگلہ زبان میں کرنے کی مہم شروع کی ہے۔ اس سلسلے میں تین ترجمے وہ اب تک پمفلٹ کی صورت میں شائع کر چکے ہیں ــــــ انسان اپنے آپ کو پہچان، مذہب کی طرف واپسی، علم کی گواہی۔ الرسالہ مشن سے وہ مکمل طور پر متفق ہیں اور اپنی پوری زندگی اسی مشن کے لئے وقف کئے ہوئے ہیں۔

۶ بھارتیہ ودیا بھون کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے بمبئی کا سفر کیا اور وہاں ۱ ۔ ۲ اکتوبر ۱۹۹۴ کو ہونے والی پیس کانفرنس میں شرکت کی اور موضوع پر اظہار خیال کیا۔

۷ اکتوبر ۱۹۹۴ میں فرینکفرٹ (جرمنی) میں کتابوں کی انٹرنیشنل نمائش ہوئی۔ الرسالہ کے ایک ہمدرد نے اس نمائش میں ایک مخصوص اسٹال حاصل کرکے وہاں اسلامی مرکز کی انگریزی اور عربی کتابیں بھی رکھیں۔ بڑی تعداد میں لوگوں نے وہاں آکر کتابوں کو دیکھا اور اس کی بابت معلومات حاصل کیں۔

۸ بھارتیہ ودیا بھون کی دعوت پر اکتوبر ۱۹۹۴ کے پہلے ہفتہ میں صدر اسلامی مرکز نے بمبئی کا سفر کیا۔ وہاں بھارتیہ ودیا بھون کے پروگرام میں شرکت کے علاوہ شہر میں مختلف مقامات پر تعلیم یافتہ مسلمانوں کے اجتماع ہوئے جس میں خطاب کیا گیا اور سوالات کے جواب دئے گئے۔ اس سفر کی روداد انشاء اللہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۹ اکتوبر ۱۹۹۴ کے پہلے ہفتہ میں صدر اسلامی مرکز نے پونہ کا سفر کیا۔ یہ سفر حلقۂ الرسالہ کی دعوت پر تھا۔ وہاں مختلف دعوتی اور تربیتی پروگرام ہوئے۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ سفرنامہ کے تحت الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۱۰ ہندی اخبار راشٹریہ سہارا کے نمائندہ مسٹر کملیش ترپاٹھی اور مسٹر سراج ساحل نے ۱۰ اکتوبر ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر خواتین کے بارہ میں اسلامی قانون سے تھا۔

۱۱ مسٹر جیمز فورستھ (James Forsyth) ایک انگریز جرنلسٹ ہیں۔ آجکل وہ کیلی فورنیا (امریکہ) میں رہتے ہیں۔ وہ ایک ناول لکھنا چاہتے ہیں جس کا بنیادی کیرکٹر ایک مسلمان ہوگا۔ اس سلسلہ میں وہ اسلام کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ ۱۱ اکتوبر ۱۹۹۴ کو وہ دہلی آئے اور صدر اسلامی مرکز سے تفصیلی انٹرویو لیا۔ ان کے سوالات کا تعلق اسلام کے تمام پہلوؤں سے تھا۔ اپنے ناول کا تھیم انھوں نے ان لفظوں میں بیان کیا:

The main character in my proposed novel is trying to be a Muslim

۱۲ بمبئی سے چھپنے والے گجراتی ہفت روزہ ابھیان (Abhiyaan) کے نمائندہ مسٹر وجے ترویدی نے ۱۳ اکتوبر کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ ابھیان کا ایک شمارہ مختلف مذہبوں پر نکل رہا

ہے۔ اس سلسلہ میں وہ اسلام کی تعلیمات پر بھی ایک مستقل مضمون دے رہے ہیں۔ انٹرویو اسی سلسلہ میں تھا۔

۱۳ ہندی اخبار ہندستان کے نمائندہ مسٹر سنیل دت اور مسٹر اشوک کنکر نے ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر "اردو اور مسلمان" سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ آزادی کے بعد اردو کو زوال نہیں ہوا ہے۔ اب وہ کئی دوسری زبانوں کی طرح بیک وقت دو رسم الخط میں لکھی جا رہی ہے۔ ایک فارسی رسم الخط میں اور دوسرے دیوناگری رسم الخط میں۔ جیسے کہ گجراتی، ترکی، مالیزی وغیرہ زبانیں بیک وقت دو رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں۔

۱۴ جن ستا کے نمائندہ مسٹر صفدر رضوی نے ۱۶ اکتوبر ۱۹۹۴ کو ٹیلیفون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ اس کا تعلق رام مندر ٹرسٹ سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ اس معاملہ میں پوری کے شنکر اچاریہ کی بات درست ہے کہ سپریم کورٹ کا فیصلہ آنے سے پہلے کوئی اقدام نہیں کیا جانا چاہئے۔

۱۵ کرزن روڈ (نئی دہلی) پر ۱۶ اکتوبر ۱۹۹۴ کی شام کو سوامی اوم پورن سوتنترا کی رہائش گاہ پر ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میں تعلیم یافتہ ہندو صاحبان شریک ہوئے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور ملک میں امن اور ترقی کے موضوع پر اظہار خیال کیا۔

۱۶ جناب رفیق لودیا کے تعاون سے اکتوبر ۱۹۹۴ میں ڈاکٹر ثانی اثنین خاں نے جرمنی اور انگلینڈ کا سفر کیا۔ اس کا مقصد انسائیکلو پیڈیا آف قرآن کے لئے ضروری تاریخی مواد حاصل کرنا تھا۔

۱۷ نیو ہورائزن اسکول (نئی دہلی) میں دعوت کے موضوع پر ایک سیمینار ہوا۔ یہ یونیورسل بیس فاؤنڈیشن نے منظم کیا تھا۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز بھی مدعو تھے۔ انھوں نے اس میں شرکت کی اور ۲۲ اکتوبر ۱۹۹۴ کو دعوت کے موضوع پر تقریر کی۔ ایک بات یہ کہی گئی کہ فرقہ وارانہ کشیدگی کے ماحول میں صرف انفرادی دعوتی کامیابی ممکن ہے۔ دعوت کے عمومی فتحیاب کے لئے ہمیں یک طرفہ اعراض کے ذریعہ موجودہ کشیدگی کو ختم کرنا ہوگا۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملّت کی ذہنی تعمیر میں حصّہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوّت ہے اور ملّت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۲۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs 70	ایک سال	$20 / £10	$10 / £5
دو سال	Rs 135	دو سال	$35 / £18	$18 / £8
تین سال	Rs 200	تین سال	$50 / £25	$25 / £12
پانچ سال	Rs 300	پانچ سال	$80 / £40	$40 / £18
خصوصی تعاون (سالانہ)	Rs 500	خصوصی تعاون (سالانہ)	$100 / £50	

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اُردو

تذکیر القرآن جلد اول	200/-
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبر انقلاب	40/-
مذہب اور جدید چیلنج	45/-
عظمتِ قرآن	30/-
عظمتِ اسلام	50/-
عظمتِ صحابہ	7/-
دینِ کامل	50/-
الاسلام	40/-
ظہورِ اسلام	40/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاءِ اسلام	20/-
رازِ حیات	50/-
صراطِ مستقیم	40/-
خاتونِ اسلام	50/-
سوشلزم اور اسلام	40/-
اسلام اور عصرِ حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروانِ ملت	45/-
حقیقتِ حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دورِ جدید کا خالق	25/-
حدیثِ رسولؐ	25/-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	-
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	20/-
راہِ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	60/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-

مطالعۂ سیرت	9/-
ڈائری جلد اول	-
کتاب زندگی	40/-
انوارِ حکمت	-
اقوالِ حکمت	20/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدیدِ دین	20/-
عقلیاتِ اسلام	30/-
مذہب اور سائنس	-
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	8/-
اسلام دینِ فطرت	7/-
تعمیرِ ملت	6/-
تاریخ کا سبق	7/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارفِ اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	7/-
ایمانی طاقت	7/-
اتحادِ ملت	7/-
سبق آموز واقعات	7/-
زلزلۂ قیامت	10/-
حقیقت کی تلاش	7/-
پیغمبرِ اسلام	5/-
آخری سفر	7/-
اسلامی دعوت	7/-
خدا اور انسان	7/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	5/-
دینی تعلیم	7/-

حیاتِ طیبہ	7/-
باغِ جنت	7/-
نارِ جہنم	7/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	7/-
مضامین اسلام	30/-
تعددِ ازواج	3/-
ہندستانی مسلمان	40/-
روشن مستقبل	7/-
صومِ رمضان	7/-
علمِ کلام	9/-
اسلام کا تعارف	4/-
علماء اور دورِ جدید	8/-
سیرتِ رسولؐ	
ہندستان آزادی کے بعد	3/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کرچکی ہے	8/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	7/-
الاسلام یتحدی	85/-

ہندی

سچائی کی تلاش	8/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
پیغمبرِ اسلام	4/-
سچائی کی کھوج	-
آخری سفر	8/-
اسلام کا پریچے	8/-
پیغمبرِ اسلام کے مہان ساتھی	8/-
راستے بند نہیں	7/-
جنت کا باغ	8/-
بہو پتنی واد اور اسلام	3/-
اتہاس کا سبق	9/-
اسلام ایک سوابھاوک مذہب	

English

God Arises	85/-
Muhammad	85/-
The Prophet of Revolution	
Islam As It Is	40/-
God-Oriented Life	60/-
Religion and Science	40/-
Indian Muslims	65/-
The Way to Find God	12/-
The Teachings of Islam	15/-
The Good Life	12/-
The Garden of Paradise	15/-
The Fire of Hell	15/-
Man Know Thyselfl	4/-
Muhammad	5/-
The Ideal Character	
Tabligh Movement	20/-
Polygamy and Islam	3/-
Words of the Prophet	--
Islam the Voice of Human Nature	--
Islam the Creator of Modern Age	--

آڈیو کیسٹ

حقیقتِ ایمان	25/-
حقیقتِ نماز	25/-
حقیقتِ روزہ	25/-
حقیقتِ زکوٰۃ	25/-
حقیقتِ حج	25/-
سنتِ رسولؐ	25/-
میدانِ عمل	25/-
پیغمبرانہ رہنمائی	25/-
اسلامی دعوت کے جدید امکانات	25/-
اسلامی اخلاق	25/-
اتحادِ ملت	25/-
تعمیرِ ملت	25/-
نصیحتِ لقمان	25/-

ویڈیو کیسٹ

حقیقتِ روزہ	150/-

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

